بسم الله الرحمن الرحيم

افسانے

مُردہ جسم

تحریر

نجیب اللہ زڑ گئے علی خیل

ترجمہ

صفیہ شیرین خان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

- کتاب :: مُردہ جسم
- تحریر :: نجیب اللہ زڑگئے علی خیل
- ترجمہ :: صفیہ شیرین خان
- کمپوز :: صفیہ شیرین خان
- ٹائٹل :: الکراش کمپیوٹر گرافکس آرچر روڈ کوئٹہ
- پبلشرز :: گواڑخ پبلی کیشن جناح سینٹر جناح وڈ کوئٹہ
- تعداد :: 500
- سال اشاعت :: 2019ع
- قیمت :: 120 روپے

ملنے کا پتہ: السراج بک سینٹر، جناح سینٹر جناح روڈ کوئٹہ

اباسین کتاب پلورنزئی۔ قصبہ کالونی کراچی

ال جان بک شاپ اینڈ پبلشرز شیرانی مارکیٹ ستار روڈ کوئٹہ

غزنوی کتب خانہ قندھاری بازار کوئٹہ

پشتو اکیڈمی بک شاپ، پشتو ڈپارٹمنٹ یونیورسٹی آف پشاور

انتساب

اپنی پیاری

مور جان (امی جان)

اور والد جیسے شفیق بڑے بھائی

زرین خان

کے نام

جن کی وجہ سے آج میں علم و ادب سے آشنا ہوں

صفیہ شیرین خان

فہرست

محترمہ صفیہ شیرین خان ۔۔۔۔۔۔سید فرید اللہ شاہ حساس 6

زڑ گئے اور اُس کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صفیہ شیرین خان 11

افسانے

انصاف 16

سفر ایک رات کا 21

مردہ جسم 28

خودکش 31

کرائے کی پتلون 38

چُڑیل 42

عیاشی 48

مصور 53

گمان 65

وسواس 67

مبارز 72

چمچہ 77

محترمہ صفیہ شیرین خان کے ترجمہ کردہ یہ افسانے

زندگی وقت کے ساتھ ساتھ اپنے رنگ بدلتی رہتی ہے۔ یعنی تغیر و تبدیلی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی ہر شے کی طرح ادب بھی زندگی کے تقاضوں کے ساتھ تبدیل ہوتی آئی ہے۔ وقت کے بدلتے ہوئے رویوں اور رتوں کے ساتھ فکشن نے بھی کئی روپ بدلے۔ داستان کے بعد ناول اور ناول کے بعد افسانہ فکشن کے تین ایسے پڑاؤ ہیں، جہاں زندگی کے مختلف رنگ اپنے اپنے وقت کی ترجمانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

داستان، ناول اور افسانہ دراصل ایک ہی نثری صنف کے مختلف روپ ہیں۔ ان تینوں کو ملا کر "افسانوی ادب" یا فکشن کا نام دیا جاتا ہے۔ ان تینوں کی بنیادی خصوصیت ایک ہے اور وہ "قصہ پن" ہے۔ یعنی ہر قدم پر یہ جاننے کی خواہش کہ آگے کیا ہو گا؟ اور اس کے بعد کیا ہو گا۔ یہ کہانی پن اور قصہ پن ہی کہانی کی جان ہوتی ہے۔ جب انسان کو بہت فرصت تھی تو وہ ایسے قصے یا داستان سنتا اور سناتا تھا جو بہت طویل ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں وہ ایسی چیزوں پر یقین کر لیتا تھا جو عقل کو دنگ کر دیتی تھیں۔ داستانوں میں اس کی بہتات ہوتی تھی مگر زمانے کا ورق پلٹا، انسانی مصروفیت بڑھی اور غیر فطری باتوں پر سے اس کا ایمان اٹھ گیا۔ زندگی کے حقیقی واقعات کو اس نے اپنا موضوع بنایا اور غیر ضروری طوالت سے دامن بچایا تو ناول وجود میں آیا۔ مصروفیت تھوڑی اور بڑھی تو افسانہ وجود میں آیا۔ افسانہ چوں کہ چھوٹا ہوتا ہے اس لئے اس میں پوری زندگی کو پیش نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس میں زندگی کا ایک رخ یا کسی کردار کے ایک پہلو کو ہی پیش کیا جاتا ہے۔

پروفیسر وقار عظیم کے مطابق "مختصر افسانہ ایک ایسی نثری داستان ہے جس میں اختصار اور سادگی کے ساتھ ساتھ اتحاد اثر، اتحاد زماں اور اتحاد کردار بدرجہ اتم موجود ہو، اور جس کی ابتدا ہو، ارتقاء ہو اور خاتمہ ہو زندگی کی بصیرت میں اضافہ کرے"۔

ہر فکشن لکھنے والا اپنے وقت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے تلخ و شیریں حقائق اپنے نوکِ قلم کے ذریعے لوگوں کے سامنے لاتا ہے اور معاشرے کو اس کی خامیوں اور بدصورتوں سے آگاہ کرکے اس کی حقیقی تصویریں دکھاتا ہے۔

نجیب اللہ زڑ گئے علی خیل بھی موجودہ دور کا ایک نمائندہ لکھاری ہے۔ وہ لفظوں کی حرمت کا پاس رکھ کر سچے جذبوں کو کھرے انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ پشتو اور اردو زبانوں میں کئی کتابوں کے خالق ہیں۔ حال ہی میں اس کے پشتو افسانوں کی ایک کتاب "سوڑ وجود" کو بہترین افسانوں کی کٹگیری میں "طاہر کلاچوی ایوارڈ بنوں ۲۰۱۷۔۱۸" سے نوازا گیا۔ نجیب اللہ زڑ گئے علی خیل کے انہیں بہترین افسانوں کو اب محترمہ صفیہ شیرین خان نے پشتو سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک زبان کا دوسرے زبان میں ترجمہ کرنا کافی مشکل کام ہے۔ کیوں کہ اس کے لئے دونوں زبانوں پر عبور و دسترس کے ساتھ ساتھ لسانی شعور بھی ضروری ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ محترمہ صفیہ شیرین خان نے پوری جانفشانی اور کمال مہارت سے نجیب اللہ زڑ گئے علی خیل کے ان افسانوں کو اس طرح ترجمہ کیا ہے، کہ ان افسانوں کی اصل روح کو پڑھنے والوں تک پہنچانے کی پوری کوشش کی ہے۔

زیر نظر کتاب "مردہ جسم" کے افسانوں کا اگر ہم مجموعی طور پر جائزہ لیں تو یہ تمام افسانے ہمارے اردگرد موجود کرداروں کی کہانیاں ہیں۔ ہمارے معاشرے کے مجموعی اور انفرادی رویوں کے عکس ان افسانوں میں ہمیں گاہے بگاہے نظر آئیں گے۔

یہاں پر زیر نظر مجموعہ "مردہ جسم" کے چند افسانوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

افسانہ "انصاف" میں دس سالہ بھیک مانگتی شانتی اپنی عزت گنوا کر جان کی بازی بھی ہار جاتی ہے۔ سیٹھ محبوب قانون اور شانتی کا مجرم ہونے کے باوجود بھی اہل معاشرے کے لئے معزز اور عزت دار ہی رہا اس کے پیچھے چھپے مکرو چہرے کا ایک عکس دکھایا گیا ہے۔ سچے اور کھرے کرداروں کی یہ کہانی اتنی مانوس ہے کہ ان سے ہمارا روز کا واسطہ پڑتا ہے۔

"سفر ایک رات کا" ایک خواب کی کہانی جو حقیقت بیان کرتی نظر آتی ہے۔ خواب کا یہ حادثہ جاری حقیقی زندگی کی تلخ حقیقت ہے جس کو افسانہ نگار نے کمال مہارت سے خوبصورت افسانہ بنایا ہے۔ افسانہ "مردہ جسم" بے بسی اور لاچاری، غربت اور مجبوری کی تصویر، جس میں ایک بیمار باپ، بھوکے بچوں اور ایک نوخیز جوان لڑکی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ "خودکش" میں فدا نامی ایک مذہبی طالب علم کی کہانی جو انجانے میں ملا نازک جیسے عیار اور ملک دشمن شخص کے ہاتھوں خودکش حملے کے لئے تیار کرایا جاتا ہے، لیکن ایک اور مقامی مولوی کی باتیں اس کو اس فدائی حملے سے روکنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ سچ اور جھوٹ، اچھے برے کی کشمکش اس افسانے کی خوبصورتی اور کمال ہے۔ افسانہ "کرائے کی پتلون" میں معاشرے کی بے حسی کا رنگ دکھایا گیا ہے جو ایک نوجوان کے خوابوں اور ارمانوں کا خون کرنے کے لیے اہم کردار نبھاتی ہے۔ اس افسانے میں بے بسی کی تصویر بھی ہے اور اپنی مجبوریوں پر ماتم بھی۔

"چڑیل" افسانے میں چودہ سال کی ماہ گل کو اس کی خوبصورتی وبالِ جان بن چکی ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ عیار مولوی کی نظر کا شکار ہے تو دوسری طرف اسے خوابوں کے شہزادے کا انتظار ہے۔ دیوانگی میں وہ بھاگتی کہیں اور ہے اور جاتی کہیں اور، شدت احساس اور نفسیاتی ماحول کی بھرپور عکاس یہ کہانی افسانہ نگار کے فن اور مہارت کی گواہ ہے۔

"عیاشی" اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دوسروں کی عزت سے کھیلنے والے کی کبھی کبھی خود کی عزت بھی داؤ پر لگ جاتی ہے۔ "مصور" میں مصور کے عشق کی ادھوری داستان کا ذکر کیا گیا ہے۔ محبت کے ادھورے پن کے کرب سے گزرنے کی ادھوری داستان کا عکس بیان کیا گیا ہے۔ "گمان" میں پچیس سالہ جوان لڑکی کا قصہ ہے جس کا حادثاتی طور پر ہاتھ کی نبض کٹ جاتی ہے اور وہ یہ گمان کرتی ہے کہ لوگ سوچیں گئے کہ اس نے خودکشی کی ہے لیکن وہ اور اس کا رب جانتے ہیں کہ حقیقت کچھ اور ہے۔ افسانہ نگار نے اس میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کی بعض حقائق ایسے نہیں ہوتے جیسے ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔

"وسواس" بھی گل خان کے ادھورے خوابوں کی ادھوری داستان ہے، جس میں خواب بھی ادھورے ہیں اور ان کی تعبیریں بھی دھواں دھواں ہیں۔ "مبازر" ایک ایسے پڑھے لکھے سماجی کارکن کی کہانی ہے جس نے اپنی پوری زندگی اپنی زبان اور پسے ہوئے عوام کی ترقی کے لئے وقف کی، جس سیاسی پارٹی سے وہ دل و جان سے وابستہ ہوتا ہے اسی پارٹی میں کچھ مفاد پرست لوگوں کی وجہ سے خانزادہ جیسے محب وطن ورکر نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مایوسیوں کے دلدل میں پھنس کر زندگی نشے کے نام کر جاتا ہے۔ نجیب اللہ زڑ گئے نے اس افسانے میں ملکی سیاست کے پیچ و خم سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جس پر افسانہ نگار داد کے مستحق ہیں۔

مختصر یہ کہ نجیب اللہ زڑ گئے علی خیل کے یہ افسانے زندگی کی صداقتوں کی ایسی داستانیں ہیں جو اس کے فن کے کمال و جمال کی سطر در سطر گواہی دیتی نظر آتی ہیں۔ محترمہ صفیہ شیرین خان کی یہ کاوش کہ اس نے پشتو سے اردو میں ان افسانوں کو ترجمہ کیا، ایک قابل ستائش و صد آفرین کام ہے۔ امید ہے کہ اردو ادب کے فکشن کے تراجم میں یہ ایک

اچھا اضافہ ہو گا۔ کیوں کہ پشتو افسانہ اپنے اندر لا محدود رنگ رکھتی ہے، جو یقیناً اردو ادب کے دلدادہ حضرات کے لئے کسی تحفے سے کم نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اردو ادب کے چاہنے والے اس سے بھرپور استفادہ حاصل کر سکیں گے۔

اور وقت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم بین الاقوامی ادب کے ساتھ اپنے ملک کے علاقائی رنگوں کو بھی قومی ادب سے روشناس کروائیں۔

بصد احترام

سید فرید اللہ شاہ حساسؔ

پشاور

13 جولائی 2019

بروز ہفتہ

زڑگئے اور اُس کے افسانے "مردہ جسم"

؎ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہر ادب میں عصری رجحانات کا وجود لازمی جز ہے۔ بقول افلاطون کہ "ہر اعلیٰ اور پائیدار ادب کی بنیاد خلوص پر قائم ہوتی ہے۔ ادب میں جتنا خلوص ہو گا وہ اتنا ہی بلند اور ابدی ہو گا"۔

خلوص کا مفہوم یہ ہے کہ مصنف، ادیب ادب میں اپنے جذبات، احساسات کا اظہار کر کے دنیا کی دوسری تمام اشیاء پر سچائی، صداقت اور کھلے دل سے تبصرہ کرے۔ معاشرے میں ہونے والے مصائب، واقعات پر کڑی تنقید کر کے ان کی اصلاح کرے۔

ادیب، مصنف کا ایک اور اہم کام یہ ہوتا ہے کہ وہ وہی بات لکھے جو اس کی نظروں کے سامنے ہو۔ یا اس کے تجربات کا نچوڑ ہو اور سچائی پر مبنی ہو۔ جو ادیب کے ذاتی تصورات، تاثرات اور اس کی تخلیق کے رجحانات کا حصہ ہو۔ تا کہ ہر کوئی برملا یہ کہنے پر مجبور ہو کہ

"گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

ادیب اپنے معاشرے میں ہونے والے نامناسب حالات و واقعات، مسرت، درد و غم کی کیفیات کا دوسرا عکس اور آئینہ دار ہوتا ہے۔ ان کی تحریریں معاشرے کے اتار چڑھاؤ کی مکمل عکاسی کرتی ہیں۔

غرض کہ اعلیٰ درجے کے ادب میں مصنف کی شخصیت نمایاں رہتی ہے۔ ادب میں مصنف اپنی ذاتی تجربات کو سمولیتا ہے۔ ادب میں ادیب کی ذاتی تجربات، جذبات، اصلیت کا پایا جانا اعلیٰ ادب کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ معمولی ادب میں ادیب سنی سنائی باتوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ جبکہ اعلیٰ ادب میں ادیب اپنے ذاتی تجربات کو بیان کرکے ادب کے اعلیٰ مقام کو قائم و دائم رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔ وہ مخلصانہ انداز میں اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے اس ذمہ داری کو بڑے خلوص نیت کے ساتھ نبھانے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔

اسی طرح ذمہ داری کا ذمہ موجودہ پرآشوب دور میں نجیب اللہ زڑ گئے علی خیل نے اپنے کاندھوں پر اٹھائے رکھا ہے۔ مصنف نے اس ذمہ داری کو بہ خوشی قبول کرتے ہوئے حق اور سچائی کے ساتھ معاشرے میں پھیلے ناہمواریوں کی اصلاح کا بھیڑہ اٹھا رکھا ہے۔

اپنی تحریروں اور علمانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انتھک محنت، دن رات کی کوششوں اور سخت ذہنی و جسمانی مشقت کے بعد مصنف کی تحریر کردہ کتاب "سوڑوجود" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

"مردہ جسم" پشتو زبان میں تحریر کردہ افسانوں (سوڑ وجود) کا اردو ترجمہ ہے۔ "مردہ جسم" کے افسانوں میں زندگی کے تلخ حقائق سے پردہ ہٹایا گیا ہے۔ معاشرے میں ہونے والے ان تمام حقائق کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے جو معاشرے میں بگاڑ کا باعث ہیں۔

نجیب اللہ زڑ گئے علی خیل اپنے علمی، ادبی، سماجی او صحافتی مقام کی وجہ سے جانے پہچانے شخصیت ہیں۔ ان کے ادبی، علمی اور صحافتی خدمات بلوچستان (جنوبی پشتونخوا) کے ادب کا ایک اہم ورثہ ہیں۔ زڑ گئے علی خیل صاحب اپنی علمی ادبی کاوشوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ملک و قوم کے اصلاح کیلئے ہمہ وقت کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ پشتو اکیڈمی کوئٹہ کی خدمت کیلئے وقف کر رکھا ہے۔ پشتو اکیڈمی سے وابستگی نے زڑ گئے صاحب کے قلم سے بے شمار شہکار تخلیق کروائے ہیں۔ اور انہی میں سے ایک شہکار "سوڑ وجود" یعنی "مردہ جسم" کے افسانوں کا اردو ترجمہ ہے۔ جس کی ذمہ داری وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے میرے ناتواں کندھوں پر آپڑی۔

وقت و حالات کے بدلتے ہوئے دھارے کو دیکھتے ہوئے "سوڑ وجود" کے افسانوں کا اردو ترجمہ اردو ادب کے لئے اہم ضرورت بن چکی تھی۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے "سوڑ وجود" کے افسانوں کا اردو ترجمہ "مردہ جسم" کے نام سے کیا گیا۔

"سوڑ وجود" کے افسانوں کا ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کٹھن مراحل کا سامنا کرنا ہر بڑے ادبی ورثہ کا حق ہوتا ہے۔ مگر اپنی ناتواں اور کمزور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کی سعی کی۔ امید ہے کہ قارئین کو میری یہ ادنیٰ سی کوشش پسند آئے گی۔

زڑ گئے علی خیل صاحب کے قلم نے ہمیشہ سچائی کا ساتھ دیا۔ اپنے قلم کی نوک سے ہمیشہ سچائی و حقائق کو منظرعام پر لانے کیلئے بھرپور کوشش کرتے ہوئے پوری ایمانداری کے ساتھ اپنے اس فرض کو نبھایا۔ علمی ادبی کاوشیں ہوں یا سماجی بہبود کی فلاح، ظلم کے خلاف احتجاج ہو یا مظلوم کے حق میں آواز اٹھانا، زڑ گئے علی خیل کو صف اول میں پائیں گے۔

"سوڑ وجود" زڑگئے صاحب کی ذاتی محنت، علمی کاوش اور جذبہ انسانیت کا ثمر ہے۔ جس کا اردو ترجمہ آپ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

زڑگئے علی خیل صاحب کی یہ کتاب مکمل طور پر حقیقت اور سچائی پر مبنی کتاب ہے۔ تمام طرح افسانے سچائی کا وجود لیے معاشرے کی عکاس ہیں۔ ان کے افسانوں میں مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا گیا ہے۔ زندگی کی تلخ اور کڑوے حقائق سے عوام الناس کو آگاہ کیا گیا ہے۔ وہ تلخ حقیقت جس کی سچائی سے اکثر و بیشتر لوگ نالاں رہے ہیں اور ان حقائق سے ہر کوئی آنکھیں چراتے کتراتے پھرتے ہیں۔ "مردہ جسم" معاشرے کی ان تمام تر تلخ عوامل پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اپنے انہی افسانوں کے تحت ان تلخ حقائق سے اصلاحی پہلوؤں کے ساتھ پردہ کشائی کی ہے۔

"سوڑ وجود" اپنے طرز کی ایک منفرد کتاب ہے، اپنے اسلوب و بیان، سادہ الفاظ اور عام فہم زبان کا دلکش مجموعہ ہے اور اسی دلکشی کو "مردہ جسم" میں ترجمہ کرتے وقت بھی برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

عام فہم، سادہ اور سلیس زبان کی وجہ سے یہ قارئین کیلئے دلچسپی کا باعث بن سکتی ہے۔ ان میں تمام افسانے اہمیت کے حامل ہیں، لیکن ان افسانوں میں، افسانہ "مبارز" اور "مصور" اپنی نوعیت کے منفرد افسانے ہیں۔ "مبارز" میں معاشرے میں ہونے والی سیاسی ناانصافیوں کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے۔ زڑگئے صاحب کے لکھے ہوئے پشتو افسانے "گمان" اور "چیچہ" جو کہ کتاب "سوڑ وجود" کا حصہ نہیں تھے بلکہ سہ ماہی پشتو میگزین "لیکنی" میں شائع ہوئے تھے کو اس ترجمہ کردہ کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

"سوڑ وجود" کا پشتو ادب سے اردو ادب میں ترجمہ یقیناً ایک اہم، غیر معمولی اور منفرد کام ہے۔ اور اس منفرد کام کو "طاہر کلاچوی ایوارڈ بنوں ۲۰۱۷-۱۸" سے بھی نوازا

گیا، جو بلوچستانی ادب کے لئے فخریہ مقام ہے۔ "سوڑ وجود" نہ صرف پشتو ادب میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے، بلکہ اردو اور انگریزی میں ان کے تراجم اس کی مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ "سوڑ وجود" کا انگریزی ترجمہ "Corpse" کے نام سے ظہور احمد پردیس صاحب کے زیر اشاعت کیا جانا ابھی باقی ہے۔ امید ہے کہ میری یہ ادنیٰ سی کوشش بلوچستان کے ادبی ورثہ میں اضافے کا سبب ہو اور "مردہ جسم" بلوچستان کے ادبی ورثہ میں چمکتا دھمکتا روشن ستارہ ثابت ہو۔

آخر میں پشتو اور اردو ادب کے مشہور و معروف ڈرامہ نگار، مزاح نگار جناب فرید اللہ شاہ حساس صاحب کی بہت مشکور ہوں جنہوں نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اس ترجمہ کردہ کتاب پر اپنی علمی آرا آپ قارئین کے سامنے تحریری طور پر پیش کی۔ اور "گوادرخ پبلی کیشن کوئٹہ"، خاص طور پر شاہین بارانزئی صاحب کی بھی بہت مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کا ذمہ اپنے سر لیا۔

آپ سب کے دعاؤں کی طلبگار۔

والسلام

صفیہ شیرین خان

کوئٹہ

05-11-2019

انصاف

اس کی بڑی بڑی آنکھیں زیادہ رونے سے سُرخ پڑ گئی تھیں۔ نازک ہونٹ پیلے پتوں کی طرح خشک ہو گئے تھے۔ ہاتھ خُدا جانے کب دھوئے ہونگے۔ ایسے میلے کہ سفید نازک ہاتھوں پر میل کی ایک تہہ جم گئی تھی۔ بورے بال گرد اور تنکو سے بھرے تھے۔ پاؤں پر میل اور ایڑیاں پھٹی ہوئی جیسے کسی نے چھری سے کاٹ لیے ہوں۔ زیادہ رونے سے اُس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اُس کے خوبصورت چہرے پر حالات کی ستم ظریفی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ وہ مردانہ درندگی کا شکار ہوئی تھی۔

ہمارا معاشرہ؟ وہ معاشرہ جہاں کسی کی عزت محفوظ نہ ہو؟ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ کسی کی بہن، کسی کی بیٹی ہو گی۔ اس کی بھی باعزت زندگی گزارنے کا خواب ہو گا۔ ہمارا معاشرہ۔ بے حس معاشرہ۔ ظالم معاشرہ۔ زنانہ وقار کی عزت کا دشمن معاشرہ۔ تم نے اُس کی آنکھوں میں نہیں دیکھا؟ کتنا خوف تھا۔

پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں خوفزدہ بیٹھی، کتنا کرب تھا اُن آنکھوں میں۔ ہر مرد سے وہ خوفزدہ تھی۔ ضرور ہو گی خوفزدہ۔ ہمارے معاشرے کے ایک شریف خاندان کے ایک شریف جانور نے اُس کی عزت لوٹی تھی۔ بھیک مانگنا اُس کا قصور تھا۔ غربت کی ماری اُس شخص کی زیادتی کا شکار بنی جو چھ بچوں کا دادا تھا۔ ساٹھ سال سے بھی عمر بڑھ چکی تھی۔ اُس نے ظلم و ہوس کی انتہا کر دی تھی۔ وہ کسی بھی رعایت یا معافی کا حق دار نہیں تھا۔ لیکن ایس۔ ایچ۔ او نے اُس کے سامنے بسکٹ اور چائے رکھی تھی۔ اُس کے ایک

ہاتھ میں چائے کا کپ اور دوسرے ہاتھ میں نکوٹن برسانے والا جلتا سلگتا سگریٹ تھا۔ وہ کبھی کبھی سگریٹ کے کش کے ساتھ اُس کی طرف طنزیہ مسکراہٹ دیکھ لیتا، جیسے وہ دل ہی دل میں اُس سے کہہ رہا کہ کیوں؟ اگر تم نہ چیختی چلاتی تو آج یہاں تھانے میں نہیں، بلکہ میرے گھر میں ہوتی، تمھارے تمام خواہشات پورے ہونے کو ہوتے۔ تم بالکل ہی جاہل ہو، تم نے زندگی کے مزے کہاں دیکھیں ہیں؟

شانتی۔ دس سالہ شانتی۔ جو مردانہ ہوس کا شکار ہوئی تھیں۔ ایسی بیٹھی تھی جیسے اُس کا سب کچھ لُٹ چکا ہو۔ واقعی اُس کا تو سب کچھ لُٹ چکا تھا۔ اُس کی وہ عزت لُٹ چکی تھی جس پر ہر زن کا وقار قائم ہوتا ہے۔ وہ عزت جو بھائیوں اور باپ کے سر کا دستار ہوتا ہے۔ ماں کی چادر نماز ہوتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ گنواں چکی تھی، سب کچھ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اُس پر ایک الزام بھی تھا اور وہ تھا چوری کا۔

آج صبح کی ہی بات ہے شانتی ہمارے محلے میں گھر گھر بھیک مانگ رہی تھی۔ اُس کے دو بھائی تھے ایک چھ سالہ اور دوسرا دو سالہ۔ شانتی کی ماں آج بیمار تھی، شانتی کا ماموں اُسے اپنے ساتھ اپنی جھونپڑی لے گیا تھا۔ شانتی ،اُس کا لنگڑا بوڑھا باپ اور دو بھائی جھونپڑی میں تھے۔ گداگروں کی یہ جھونپڑیاں امیر خاندانوں کے بنگلوں کے بالکل پیچھے تھے۔ کبھی کبھار کسی شریف خاندان کا شریف شخص اپنے گھر کی کھڑکی سے اِن جھونپڑیوں کو دیکھتا جہاں ان گداگروں کی عورتیں دنیا وما فیا سے بے خبر بغیر سر پر دوپٹہ اوڑھے اور ہلکے باریک کپڑے پہنے اپنے جھونپڑیوں کے صحن میں کام کاج میں مصروف رہتی تو ان شریف خاندانوں کے کچھ شریف لوگ ان مناظر سے لطف اندوز ہوتے۔ شانتی ہمارے محلے میں بھیک مانگ رہی تھی۔ بھیک مانگنا وہ صرف جمعرات کے دن کرتی باقی چھ دن وہ اپنے بوڑھے باپ کی خدمت کرتی۔ آج جبکہ جمعرات کا دن بھی نہیں تھا، سوموار کا دن تھا اور اُس کی

والدہ کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے وہ بھیک مانگنے نکل گئی تھی۔ جب وہ ہمارے محلے میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے وہ محلے کے شروع میں سیٹھ محبوب کے گھر کے دروازے پر بھیک مانگنے کیلیئے کھڑی ہو گئی۔ دروازہ کھٹکھٹایا، بدبختانہ آج سیٹھ محبوب کے گھر میں سوائے سیٹھ کے کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر دروازہ کھٹکھٹایا اور بھیک مانگنے کی مخصوص آواز لگائی۔ دے کچھ اللہ کے نام پہ۔

جواب میں سیٹھ محبوب نے گھر کے اندر سے دروازہ کھولا، اور شانتی کو مخاطب کر کے کہا کہ آجاؤ گھر کے کچرے باہر پھینکو، تمھیں دس روپے دیتا ہوں۔ شانتی دس روپوں کی لالچ میں گھر کے اندر گئی تو سیٹھ نے کہا کہ کچرے کمرے کے اندر ڈسٹ بین میں پڑے ہیں۔ شانتی بھی سیدھا سامنے والے کمرے کی طرف لپکی اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ انسانی روپ میں ایک درندہ صفت بوڑھے شخص کی اُس کی نازک اور کم عمر بدن پر حوس زدہ آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ جو بھی شانتی کے ساتھ کمرے میں ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔

شانتی چیختی چلاتی سیٹھ کے گھر سے باہر نکلی، کچھ ہی دیر میں سیٹھ بھی اُس کے پیچھے گھر سے باہر نکلا۔ اُس نے شانتی کو جلد ہی گھیر لیا اور اُسے ہاتھ سے پکڑ کر سیدھا قریبی تھانے چلا گیا۔ چلتے وقت شانتی کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ تکلیف کے باعث چل نہیں سکتی تھی، لیکن سیٹھ اُسے کھینچ کر لے جا رہا تھا۔ شانتی کی زبان پر صرف ایک ہی نام تھا اور وہ تھا۔ اماں، اماں۔

تھانے لے جا کر سیٹھ نے شانتی کے خلاف چوری کرنے کا پرچہ کٹوایا۔ شانتی کی زبان یہاں آتے ہی گونگ ہو گئی، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اور نہ شانتی کے گھر والوں کو پتہ تھا کہ شانتی اس وقت کن حالات سے گزر رہی ہے۔

ایک پولیس کانسٹیبل ہاتھ میں پانی کا بھرا گلاس لیے شانتی کے پاس آیا۔ یہ لو! پانی پی لو۔

شانتی نے جب پانی کا گلاس دیکھا تو اُس کے جسم میں حرکت سی پیدا ہو گئی، لپک کر پانی کا گلاس کانسٹیبل سے لیا اور ایک ہی سانس میں پینے لگی۔ پانی آدھا اُس کے حلق میں سے اور آدھا اُس کے گریبان میں گر رہا تھا۔ پانی کا گلاس خالی ہوا، شانتی کے جان میں جان سی آئی، اُس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ کمرے میں ایک کرسی پر جس کے سامنے ایک بڑا ٹیبل تھا اور اُس پر ایک سبز رنگ کا کارپٹ بچھا ہوا تھا ایک مونچھڑ پولیس آفسر بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی وہ کانسٹیبل جو شانتی کیلیئے پانی لایا تھا سیدھا اٹینشن کھڑا تھا۔ ٹیبل کے سامنے والی کرسی پر ظالم سیٹھ محبوب بیٹھا تھا جس نے شانتی کی عزت لوٹی تھی۔ کچھ دیر بعد پانی لانے والا پولیس باہر نکل گیا تھا۔ کمرے میں صرف مونچھڑ پولیس والا اور دوسرا سیٹھ محبوب گپے ہانکتے ہوئے مزے سے بیٹھے تھے۔ مونچھڑ پولیس آفسر نے سیٹھ سے کہا کہ خبر بجھوادی ہے آرہے ہونگے۔

شانتی نے جب دروازے کی طرف دیکھا تو باہر کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ یک دم باہر کے دروازے کی طرف بھاگ گئی۔ جب وہ کمرے سے باہر نکل ہی رہی تھی تو مونچھڑ پولیس آفسر کی نظر اُس پر پڑگئی۔ آفسر چیخا اور اُس کے پیچھے اپنی کرسی سے کھڑا ہوا اور چلایا۔

اوئے، پکڑو، پکڑو، لڑکی بھاگ گئی۔

تھانے کے باہر سے ایک دھڑام کی آواز آئی۔ مونچھڑ پولیس آفسر اور کانسٹیبل جیسے ہی باہر پہنچے تو شانتی گاڑی کے نیچے آچکی تھی۔ اُس کا آدھا جسم گاڑی کے ٹائر کے نیچے آگیا تھا۔ روڈ پر شانتی کا گرم خون بہت ہی آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر اب وہ کرب اور خوف نہیں تھا جو اُسے مظلوم دکھائے۔ شانتی بڑی میٹھی نیند میں اس ظالم معاشرے کے کالے چادر میں چُھپے کالے چہروں کی صاف حقیقت اپنے ساتھ لے گئی۔

سیٹھ بھی تھانے سے باہر آگیا۔ پولیس کانسٹیبل نے گاڑی کے ڈرائیور کو پکڑا تھا۔ شانتی کے ماموں اور والدہ کو خبر پہنچ چکی تھی کہ شانتی تھانے میں ہے۔ وہ بھی پہنچ گئے۔ شانتی کی والدہ نے جب یہ منظر دیکھا تو وہی بے ہوش ہوگئی۔ ڈرائیور بے چارہ چلا رہا تھا کہ مجھے پتہ نہیں یہ کیسے گاڑی کے نیچے آگئی۔ سیٹھ نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور مونچھڑ پولیس آفسر کو رُعب دار آواز میں کہا۔

ایس ایچ او صاحب! لے جاؤ اس ظالم ڈرائیور کو اور بند کردو۔ میں دیکھتا ہوں شانتی کو انصاف کیسے نہیں ملتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

سفر ایک رات کا

بڑے عرصے سے میری یہ خواہش اور سپنا تھا کہ دوبئی جاؤں اور وہاں جاکر خوب پیسے کماؤں۔ باپ کا قرضہ، بڑے بھائی کی شادی اور اپنا آنے والا کل سنوار سکوں۔

خدا کا کرنا تھا، وہ دن بھی آگیا جب میرا دوبئی کا ویزہ لگ گیا۔ سب گھر والے خوش تھے، لیکن ماں، ماں تو ماں ہوتی ہے، وہ بہت زیادہ اُداس تھیں۔ کیوں نہ اُداس ہو، اُس کے جگر کا ٹکڑا یعنی میں اُس سے جدا ہو رہا تھا۔ وہ بھی چھ سالوں کیلئے۔ خیر، دوبئی کے جہاز اُس وقت پورے ملک میں کراچی سے جاتے تھے۔ کراچی سندھ صوبے کا بلکہ پورے ملک کا سب سے بڑا شہر ہے اور اُس کا ائیرپورٹ بھی انٹرنیشنل۔ میں ایک شب کوئٹہ کے بس ٹرمینل گیا، وہاں پہنچ کر میں نے کراچی جانے کیلئے ایک بس میں ٹکٹ لیا۔ تھوڑی دیر بعد میں بس میں بیٹھا تھا اور وہ اپنی منزل یعنی کراچی کی جانب رواں دواں تھا۔

بس میں کافی کم لوگ بیٹھے سفر کر رہے تھے۔ میری ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ دوسری جانب راستے کے دوسرے طرف کی سیٹوں پر ایک جوان عورت اور ایک خوبصورت بچی جو کہ غالباً چار سال کی تھی، بیٹھے تھے۔ بس اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ عورت کبھی کبھار میری طرف دیکھ بھی لیا کرتی۔ بچی تو مجھے دیکھی جا رہی تھی۔ بہت خوبصورت بچی تھی، سیاہ خوبصورت ریشمی بال، بڑی بڑی خوبصورت ہرنی جیسی آنکھیں، نازک ملائم دودھیا ہاتھ، بالکل ایک پری کی طرح لگ رہی تھی۔ میرے واسکٹ کے جیب میں کچھ ٹافیاں تھیں، میں نے ایک ٹافی جیب سے نکالی اور بچی کی طرف بڑھائی۔ بچی نے بھی

یک دم ہاتھ بڑھا کر ٹافی لے لی۔ دھیرے دھیرے بچی میرے ساتھ مانوس ہونے لگی۔ تقریباً چار گھنٹے گزرنے کے بعد بس ایک ہوٹل پر رات کے کھانے اور عشا کی نماز کیلئے رُکی۔ میں بھی بس سے نیچے اُترا، تھوڑی ہوا خوری کی۔ کھانے کیلئے دل نہیں چاہ رہا تھا، واپس آ کر بس میں بیٹھ گیا۔ جب دیکھا تو عورت سوئی ہوئی اور بچی جاگ رہی ہے۔ میں نے بچی کو اپنے طرف آنے کا اشارہ کیا تو وہ جھٹ سے اُٹھی اور آ کر میرے ساتھ خالی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دوسرے مسافر جب آ گئے تو کنڈیکٹر نے آواز دی کہ: اپنے ساتھیوں کو چیک کریں کوئی رہ تو نہیں گیا ہے؟

مسافروں نے بھی آواز دی کہ: نہیں، چلیں خیر سے۔

بس پھر سے توکلِ خدا اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ بچی میرے ساتھ اتنی بے تکلف ہو گئی کہ ہنسنا اور کھیلنا شروع ہوا۔ تقریباً تین گھنٹے تک وہ میرے ساتھ کھیلتی رہی آخر تھک کر میری گود میں سر رکھ کر میٹھی نیند سو گئی۔

میں نے بھی کچھ نہ سوچا اور مسکرا کر اپنے آپ سے کہا کہ: بچے بھی خدا کی جانب سے فرشتوں جیسے ہوتے ہیں۔ دیکھو کتنی میٹھی نیند سوئی ہوئی ہے۔ اسے یہ بھی پتا نہیں کہ یہ آدمی پرایا ہے یا اپنا، لیکن اپنے آپ کو ہر حال میں خوش رکھتے ہیں۔

رات آہستہ آہستہ صبح کی جانب بڑھ رہی تھی اور اوپر سے ڈرائیور نے دھیمی آواز میں پُرانے انڈین گیت لگائے تھے۔ میں بھی ان پُرانے گیتوں کا شوقین تھا اور مزے سے سُن رہا تھا۔ دراصل مجھے سفر میں پرانے انڈین گیت وہ بھی رات کے وقت بہت پسند ہیں۔ کبھی کبھار قریب بیٹھی عورت کی طرف جو دنیا و مافیا سے بے نیاز دوپٹہ اپنے اوپر اوڑھے، صرف بس کے چھت کی سرخ دھیمی روشنی میں اُس کا خوبصورت چہرہ اور بند آنکھیں نظر آ رہی تھیں دیکھ لیتا۔ صبح صادق کے وقت ہم بھی کراچی کے قریب ہوئے۔

ایک گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ بچی میرے ساتھ والی سیٹ پر میٹھی نیند سو رہی تھی اور عورت اپنی سیٹ پر گہری نیند سو رہی تھی۔ میری آنکھیں تمام رات جاگنے کی وجہ سے سُرخ ہو گئی تھی۔ جسم بھی سفر کی وجہ سے درد کر رہا تھا۔ خیر یہ ایک گھنٹہ بھی گزر گیا، ہم کراچی بس سٹینڈ پہنچ گئے۔ بچی ابھی تک سوئی ہوئی تھی، میں نے آہستہ سے بچی کو سیٹ پر ٹھیک کیا، عورت کی طرف دیکھا تو وہ بھی ابھی تک سو رہی تھی۔ میں بس سے اُترا، سامان اُٹھایا، سوچا کہ جہاز ۹ بجے دوبئی کیلئے روانہ ہو گا ابھی میرے پاس دو تین گھنٹے ہیں کئی جا کر آرام کر لیتا ہوں۔ سامان اُٹھایا، دو یا تین قدم چلا نہیں تھا کہ پیچھے سے آواز آئی؛ ارے او بھائی! اپنی بچی کو تو سنبھالو۔

بچی؟ مجھے ایک دم یاد آیا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو بس کا کنڈیکٹر بچی کے ساتھ کھڑا تھا۔

یہ میرے ساتھ نہیں ہے، یہ اپنی ماں کے ساتھ ہے۔ میں نے جواب دیا۔

کیا کہا؟ کنڈیکٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔

ہاں بھائی صاحب، ماں کے ساتھ۔ میں اکیلا ہوں۔

لیکن یہ تو آپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔ کنڈیکٹر نے مجھے اس بات پر حیران کر دیا۔

او بھئی! یہ دوسری سیٹ پر بیٹھی عورت کے ساتھ تھی، اُس کے پاس لے جاؤ۔ میں نے قدرے غصے میں کہا۔

آپ ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔ کنڈیکٹر بس کی طرف مُڑا، بس میں چڑھا، جب واپس نیچے اُترا تو وہ عورت بھی اُس کے ساتھ تھی۔ عورت نے چہرہ نہیں چھپایا تھا۔ دن کی روشنی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ مجھے تو وہ شادی شدہ نہیں بلکہ کنواری لگی۔ تھوڑی دیر کیلئے میں اُس کی طرف حیران دیکھتا رہا۔ وہ سیدھا میری طرف آئی اور میرے سامنے کھڑی

ہو گئی۔ بچی کو ہاتھ سے پکڑی آئی اور اُسے میری طرف کر کے کہا؛ بھائی صاحب! اپنی بچی کو سنبھالو، ایسا نہ ہو کہ کہیں کھو جائے۔

عورت کی اس بات اور رویے نے مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ حیران تھا کہ کیا کروں؟ اور یہ عورت کیسی باتیں کر رہی ہے؟ وہ عورت بھی یہ بات کہہ کر ایک طرف کو چل دی۔

میں نے جلدی سے پیچھے سے آواز دی کہ: او بہن جی! یہ بچی میرے ساتھ نہیں، آپ کے ساتھ ہے، لے جایئے اسے۔

عورت نے ایک دم میری طرف دیکھا؛ میرے ساتھ؟ بھئی جب پال نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو؟ اور پھر دوسروں کے سر کیوں تھوپتے ہو۔ میں ایک عزت دار لڑکی ہوں، اپنا گناہ میرے سر نہ تھوپیں۔

بہن جی! میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ یہ بچی میرے ساتھ نہیں ہے۔ کل جب میں بس میں آکر بیٹھا تو یہ آپ کے ساتھ بیٹھی تھی اور اب آپ کہہ رہی ہیں کہ یہ میرے ساتھ ہے؟

اس جھمیلے میں لوگوں کی اک بھیڑ آکر جمع ہو گئی۔ بس کا ڈرائیور بھی آ گیا اور کہا کہ؛ میں آپ کو ساری رات شیشے میں دیکھ رہا تھا، یہ بچی آپ کے ساتھ تھی اور اب کہہ رہے ہو کہ یہ آپ کے ساتھ نہیں؟

استاد جی! میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ یہ بچی میرے ساتھ نہیں ہے۔ میرے آنکھوں میں آنسو آ گئے، دل ہی دل میں، میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ یہ کس مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ میرا دوبئی جانے کا خواب، سب خاک میں ملتا دکھائی دے رہا تھا۔

اسی دوران عورت نے ایک ایسی بات کہی کہ ایک امید سی بند گئی۔

ڈرائیور بھائی! بچی سے پوچھ لیں کہ یہ کس کے ساتھ ہے۔

میرے منہ سے بھی اچانک نکلا، ہاں ہاں، بالکل بچی سے پوچھ لیں۔

ڈرائیور بھی بچی کی طرف ہلکا سا جھکا اور پوچھا کہ؛ بیٹا! تم کس کے ساتھ ہو؟ اس باجی کے ساتھ ہو یا اس انکل کے ساتھ؟

انتل تے تات۔۔۔۔۔ بچی نے اپنی توتلی زبان سے معصومانہ انداز میں کہا۔

میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ بیٹھ گیا، رونے لگا اور پھر چیخ کر کہا؛ یہ میرے ساتھ نہیں ہے، یہ اس عورت کے ساتھ ہے۔ جب دیکھا تو وہاں کوئی عورت نہیں تھی، وہ وہاں سے جا چکی تھی، صرف ڈرائیور اور کنڈیکٹر وہاں کھڑے تھے۔ سامنے بچی کھڑی جس کی خوبصورت بڑی بڑی آنکھوں سے آنسوؤں کے بوند ٹپک رہے تھے۔ لیکن آواز اُس کے حلق میں دبی ہوئی تھی۔

استاد جی! یہ اس طرح نہیں مانے گا۔ میں جا کر پولیس کو بُلاتا ہوں، وہ اس کے باپ سے بھی منوائے گا۔ کنڈیکٹر نے ڈرائیور سے کہا۔

میرا بھی یہی خیال ہے۔ جاؤ لے آؤ۔

میں وہی حیران بیٹھا تھا۔ زبان گونگ ہو چکی تھی۔ منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دو پولیس والے آگئے۔ ان میں سے ایک بڑا مونچھ میری طرف آیا۔ دوسرا پولیس کانسٹبل چند قدم دور کھڑا ہو گیا۔

ہاں ڈرائیور! کیا بات ہے؟

سر جی یہ بچی کوئٹہ سے یہاں تک اس شخص کے ساتھ تھی۔ اب یہ شخص کہتا ہے کہ یہ بچی میرے ساتھ نہیں ہے۔

اچھا تو یہ بات ہے۔ اوئے لڑکے! یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ بچی تمھارے ساتھ ہے؟ پولیس والا اب میری طرف متوجہ ہوا۔

میں نے بھی اپنے اوسان سنبھالے، پولیس والے کے سامنے کھڑا ہوا۔

سر جی! میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ یہ بچی میرے ساتھ نہیں ہے۔ یہ ایک عورت کے ساتھ تھی، خدا جانے کہ اب وہ کہا غائب ہو گئی۔

یہ ڈرائیور کیا کہہ رہا ہے؟ بچی کیا کہہ رہی ہے؟ اور تم! تم کیا کہہ رہے ہو؟ ٹھیک ٹھیک بتاؤ ورنہ کراچی کے جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔

میں کیوں جھوٹ بولو نگا۔ مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ میں تو دوبئی جا رہا ہوں۔ آپ میرا پاسپورٹ، ویزہ اور جہاز کے ٹکٹ دیکھ سکتے ہیں۔

اچھا تو تم اغوا کار ہو، بچے چوری کرتے ہو اور انہیں بیرونی ممالک سپلائی کرتے ہو۔ اس مرتبہ پولیس والا اپنی اصلیت پر اُتر آیا۔ ایسے لہجے میں کہا کہ میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔

اوئے ساون!

جی سر۔

لے چل اسے تھانے، وہاں اس کے ساتھ دیکھتے ہیں کے کیا کرنا ہے۔ خدا جانے اور کتنے بچے اغوا کیے ہیں اس نے۔ اب ان کے لیڈر کا بھی پتہ چل جائے گا کہ کون ہے۔

ساتھ کھڑا سپاہی میری طرف آیا، مجھے ہاتھ سے پکڑا، میں چلانے لگا کہ: میں چور نہیں ہوں، یہ بچی میری نہیں ہے، خدا کیلئے مجھے جانے دیں، میں دوبئی جارہاہوں، میں چور نہیں ہوں۔ سپاہی مجھے اس طرح کھینچ رہا تھا جیسے بڑی عید کے بکرے کے گلے میں رسی ڈال کر اُسے بچے اپنی خوشی اور مستی کیلئے کھینچتے ہیں۔

ایک دم کمرے کا دروازہ زور زور سے کھٹکٹا۔ باہر سے والد صاحب کی آواز میرے کانوں سے آلگی، آنکھیں فوراً کھل گئیں۔

قاسم! او قاسم , بیٹا اُٹھو فجر کے نماز کا وقت نکلا جارہاہے۔ جلدی اُٹھو۔

☆☆☆☆☆☆☆

مردہ جسم

سال ۱۹۹۹،،،،،،، سردیوں کی ٹھنڈی رات ہے۔ کرم خان اپنے کمرے میں سٹوپ کے قریب بیٹھا ہے۔ سٹوپ کے ارد گرد اُس کی آٹھ بچیاں بیٹھی ہیں۔ سٹوپ کسی بے جان کی طرح ٹھنڈا پڑا ہے۔ کمرے کے باہر برف سفید چادر اوڑھے ہے۔ کرم خان کی بڑی بیٹی ۱۴ سالہ ہے جو سٹوپ میں آگ لگانے کی کوشش میں ہے۔ نائلہ کی سات چھوٹی بہنیں جن میں سب سے چھوٹی بہن جو کہ بیمار ہے سٹوپ کے ارد گرد بیٹھی سٹوپ کی طرف متوجہ ہیں۔ کمرے میں ایک دیاسلائی اپنی آخری سانسیں گن رہی ہے۔ بچیوں کے ناک سے ٹھنڈ کی وجہ رینٹ بہہ رہی ہے۔ نائلہ نے سٹوپ میں کچھ پرانے جوتے ڈالیں ہیں جو جلنے کا نام نہیں لے رہے۔ والد کرم خان چند دنوں سے بیمار تھا۔ پچھلے دو مہینوں سے کرم خان بے روز گار ہے۔ کوئی ایسا راستہ دکھائی نہیں دے رہا کہ وہ اپنا اور بچوں کا پیٹ پال سکے۔ بچوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ گھر میں جو بھی تھا وہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ کرم خان بھی کام نا ہونے کی وجہ سے چڑچڑا سا ہو گیا تھا۔ اب بھی وہ نائلہ پر غصہ تھا مگر کچھ بول نہیں رہا تھا۔

آخر برداشت کا مادہ انتہا کو پہنچا اور نائلہ پر برس پڑا۔

شام سے تم اس ایک آگ کے پیچھے لگی ہوئی ہو، ایک آگ نہیں جلا سکتی۔ اتنی بے ایمان لڑکی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی جیسے تم ہو۔ سارا دن گاؤں میں گھومتی پھرتی ہو، ایک تنکا تک گھر نہیں لا سکتی، نہ باپ کا خیال ہے اور نہ ہی ان بچیوں کا۔

بابا! میں کیا کروں؟ جوتے گیلے ہیں، سارا ماچس اس پر تمام کیا مگر کچھ کام نہیں کر رہا۔

جواب تو خوب دیتی ہو، لیکن ایک آگ نہیں جلا سکتی۔

بابا! میں نے کب آپ کو جواب دیا؟

بس، بس۔ زیادہ ہوشیاری دکھانے کی ضرورت نہیں۔ باپ کے سامنے اونچی آواز میں بات کرتی ہو، شرم، حیا نام کی کوئی چیز نہیں تم میں۔

میں نے ایسی کونسی بات کہی جو آپ اتنا غصہ کر رہے ہیں؟

میں کہتا ہوں زبان کو لگام دو ورنہ۔۔۔۔ کرم خان نے غصے میں کہا۔

ٹھیک ہے تو پھر خود آکر جلائیں اس منحوس آگ کو۔۔۔۔۔

اسی بات کے ساتھ ہی نائلہ سٹوپ کے سامنے سے اُٹھی، کرم خان نے جب یہ دیکھا تو وہ بھی اُس کے پیچھے اٹھا۔ نائلہ کو بالوں سے پکڑا اور منہ پر تھپڑ مارنے شروع کیے۔ کرم خان چلا رہا تھا کہ؛ تم نے جواب دیا ہاں، تمھاری یہ ہمت کہ اپنے باپ کو جواب دو، مجھے جواب۔۔۔۔ چلا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ نائلہ کو پیٹھ رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھی بچیاں بھی چیخنے لگی، کمرے میں اک واویلا سا مچ گیا۔ اسی دوران دیا سلائی بھی اپنے انجام کو پہنچی۔ جیسے ہی دیا بج گئی کمرے میں ایک چیخ سی گونجی۔ یہ ایسی چیخ تھی جیسے کسی بچے کو چاقو یا پھر کسی تیز دار اوزار سے مارا جائے، چیخ کے ساتھ اچانک خاموشی، دل دہلانے والی خاموشی ۔۔۔ اس چیخ نے کمرے میں خاموشی پیدا کی۔ کرم خان جلدی سے دیا سلائی کی طرف بھاگا، بھاگتے ہوئے اُس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا۔ وہ منہ کے بل گرا، لیکن پھر جلدی سے اُٹھ کر دیا سلائی کی طرف بڑا۔ دیا اُٹھایا۔ سٹوپ کی طرف بڑھا۔ ماچس ڈھونڈنے لگا۔ جیسے ہی ماچس ہاتھ لگا تو جلانے کی کوشش میں لگا۔ آخر کامیاب ہوا۔ دیا جلایا۔ دیا سلائی کی مدھم

روشنی میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک مُردہ جسم کمرے کے بیچوں بیچ پڑا ہے۔ کرم خان کی آنکھیں خوف سے باہر نکلی، آہستہ سے مردے جسم کو ہاتھ لگایا۔ لیکن جسم، جسم تو مُردہ تھا وہ کہاں حرکت کرتا۔ کرم خان نے جب یہ دیکھا تو خوف کے مارے دیا سلائی زمیں پر پھینک کر کمرے سے بھاگتا ہوا باہر نکل پڑا۔

مُردہ جسم کس کا تھا؟ نائلہ کا یا پھر نائلہ کی بیمار چھوٹی بہن کا؟ کرم خان کو اس پریشانی سے نجات مل گئی اور وہ گھر سے بھاگ گیا۔ مگر مُردہ جسم، وہ کس کا تھا؟

صبح محلے کے لوگ کرم خان کے گھر اکھٹے ہوئے۔ ایک چھوٹے سے مردے جسم کو چارپائی پر اُٹھائے قبرستان کی طرف لے گئے۔ گھر میں ایسا کوئی بھی نا تھا جو اس مردے جسم کیلیئے روتا۔ محلے کے لوگ بچوں کیلیئے کھانے کی چیزیں لائے تھے۔ سٹوپ میں آگ بھی جل رہی تھی۔ کمرہ بھی گرم تھا۔ بچے سٹوپ کے ارد گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور اِدھر اُدھر دیکھ کر یہ سوچ رہے تھے کہ اتنے زیادہ لوگ ہمارے گھر میں کیوں اکھٹے ہوئے ہیں؟

مگر وہ مُردہ جسم؟ وہ کس کا تھا؟ نائلہ کہاں گئی؟ وہ بھی کرم خان کی طرح گھر سے بھاگ گئی یا خدا نہ کرے وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

☆☆☆☆☆☆☆

خودکش

ایسا خوبرو نوجوان میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ بہت ہی خوبصورت جوان، عمر غالباً چودہ یا پندرہ کی سال ہو گی۔ داڑھی کے چند بال چہرے پر نظر آرہے تھے۔ باپ غریب نواز نے اُسے مدرسہ میں داخل کیا تھا کہ میرا بیٹا حافظ قرآن اور بڑا ہو کر ایک اچھا مولوی بنے گا۔ حافظ قرآن بن گیا جب کہ وہ ابھی تک دینی درس کے پہلے مرحلے میں تھا۔ مدرسہ کا مہتمم ہفتے میں ایک دن وہ بھی جمعرات کے دن آتا۔ کسی چیز کی خبر نہ لیتا کہ کون آرہا ہے کون جارہا ہے، کیونکہ وہ دوسرے بڑے مدارس میں درس دیا کرتا تھا۔

"فدا" درس میں بہت اچھا تھا۔ حافظہ بھی بہت تیز تھا۔ ملک میں خونی حالات تھے۔ ہر دوسرے روز بم دھماکے، خودکش حملے، لوگوں کا قتل۔ ایسے حالات تھے جیسے کسی بیرونی دشمن ملک نے حملہ کیا ہو۔

کچھ دنوں پہلے فدا گھر آیا، ماں باپ بہت خوش تھے۔ میوہ جات، گوشت، چاول یعنی ہر وہ نعمت والد غریب نواز نے اپنی غربت میں بیٹے کیلئے مہیا کی، جو اُس کے بس میں تھا۔ فدا صرف ایک رات کیلئے گھر آیا تھا۔ ماں کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کچھ دن اور گزارے لیکن فدا نے ماں سے کہا کہ؛ ماں وہاں میرا درس متاثر ہو گا۔ اب بھی میں مہتمم صاحب سے چپ کر آیا ہوں۔ صرف آپ دونوں کو دیکھنے کیلئے۔

خدا کی کرنی تھی۔ رات گزر گئی۔ صبح فجر کے وقت فدا نے اپنے والدین سے اجازت لی اور مدرسہ کی طرف روانہ ہوا۔

ہم جس ملک میں اپنی جانوں کا نظرانہ پیش کرتے ہیں یہ صرف اور صرف اسلام کی بقا کیلئے ہے۔ اس ملک کے لوگ کافر ہو چکے ہیں۔ آپ ذرا غور کریں مرد داڑھیاں منڈوا رہے ہیں، پتلون پہنتے ہیں، وہ کافر کے بنائے ہوئے کالج اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے جاتے ہیں، عورتوں پر بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، بازاروں میں کافروں کی طرح پھرتے ہیں، مسجد بھی کفار کی عبادت گاہوں کی طرح بنا لیے ہیں، یہ ایسے ٹھیک نہیں ہونگے، یہاں جہاد کی ضرورت ہے۔ ایک کمرے میں بڑی عمر کا ایک طالب نما شخص دوسرے بیٹھے ہوئے طالب علموں کے سامنے بیٹھا یہ باتیں کر رہا تھا۔

مومنوں! میری باتیں یاد رکھو، اگر آپ لوگوں نے اس کافر زمانے کا خاتمہ نہ کیا تو آنے والی مسلمانوں کی نسل آپ لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اور آخرت میں خدا اور اس کے رسولؐ کو کیا جواب دو گے۔ آج بہت ہی مبارک دن ہے۔ ہمارا ایک مومن مسلمان بھائی جنت جا رہا ہے۔ آپ لوگ اس سے مبارک باد دیں اور ساتھ ہی الوداع بھی۔

تھوڑی دیر کے بعد طالب علم اس ایک نو عمر طالب کو مبارک باد کے ساتھ ساتھ الوداع بھی کہہ رہے تھے۔ نو عمر طالب بھی خوش تھا کہ وہ جنت جا رہا ہے۔ کوئی بھی یاد نہ تھا۔ نہ ماں، نہ باپ اور نہ ہی اپنے چاہنے والے، کوئی بھی تو نہیں۔۔۔

یہ اجلاس مدرسہ کے ایک کمرے میں مہتمم صاحب سے چپ کے منعقد کیا گیا تھا۔ صرف گنتی کے دس یا پندرہ طالب علم اس اجلاس میں بیٹھے تھے۔

پچھلی مرتبہ ہمارے ایک جوان کی قربانی سے ہم نے دشمن کے تیس افراد جہنم واصل کیے۔ ایک طالب علم نے دوسرے طالب علم سے کہا۔

انشاالله اس مرتبہ سو سے بھی زائد ہونگے۔ دوسرے طالب علم نے مسکرا کر کہا۔

جمعہ کا دن تھا۔ نوعمر طالب نے خودکش جیکٹ پہنا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے اپنے ٹارگٹ پر پہنچایا۔ ان کا ٹارگٹ ایک مسجد تھا۔ جمعہ کی نماز کیلئے بہت سارے لوگ مسجد آئے تھے۔ مسجد میں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ کوئی وضو کر کے ہاتھ منہ خشک کر رہا تھا، کوئی سر پر چادر ڈالے دھوپ سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا، کوئی ایک طرف کھڑا مولانا صاحب کا وعظ سن رہا تھا۔ کوئی صفوں کے درمیان اس انتظار میں بیٹھا تھا کہ جیسے ہی جماعت کھڑی ہو جائے تو اپنے لیے جگہ بنالیں اور بہت سے لوگ تو مسجد کے بیرونی دروازے کے ساتھ کھڑے اس انتظار میں تھے کہ مولانا صاحب وعظ ختم کریں اور ہم مسجد میں داخل ہو کر باجماعت نماز میں شامل ہو جائیں۔

طالب بھی ایک طرف کھڑا اس انتظار میں تھا کہ جیسے ہی جماعت کھڑی ہو تو وہ اپنا کام سرانجام دے۔ وہ مولانا صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ کبھی کبھار اس کا دھیان جنت کی طرف جاتا۔ وہ دیکھتا کہ خوبصورت حوریں اُس کے انتظار میں پھول ہاتھوں میں لیے کھڑی ہیں۔ وہ کھڑا تھا، سب کچھ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ جیکٹ کے بم کا بٹن اُس کے اختیار میں تھا۔ وہ جنت اپنے آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ اس مسجد میں جتنے بھی لوگ ہیں سب کافر ہیں۔ میں حق پر ہوں۔ میں قربانی دونگا۔ میں یہ کام آج ضرور کرونگا۔

مولانا صاحب منبر پر بیٹھا خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے کے بارے میں وعظ کر رہا تھا۔ وہ بڑی عاجزی کے ساتھ سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں سے مخاطب تھا۔

میرے مسلمان بھائیو! اللہ نے جو ہمیں یہ جسم دیا ہے یہ اللہ کی امانت ہے۔ انسان اس زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ کسی بھی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے انسان کو ناحق ضرر پہنچائے یا پھر قتل کرے۔ ایسا کرنے

والے انسان سے اللہ تعالیٰ روز آخرت میں پوچھے گا۔ اگر کوئی برا کام کر رہا ہے تو آپ جائیں، اُسے سمجھائیں۔ اگر وہ نہ مانا تو پھر قانون ہے۔ یہ ایک اسلامی ملک ہے۔ اُسے سزا دی جائے گی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ دین کی اشاعت کا واحد راستہ دعوت ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے ساری زندگی دعوت کا کام کیا۔ مانتا ہوں کے آپؐ نے جہاد بھی کیا۔ جہاد فرض ہے۔ لیکن کس کے ساتھ؟ اُن کے ساتھ جو آپ کے ملک کا دشمن ہو، اُن کے ساتھ جو آپ کو نقصان پہنچائے، آپ کے مال کو نقصان پہنچائے، اور سب سے بڑھ کر دین مبین کو نقصان پہنچائے۔ یہ جو آج کل ہم پر کفر مسلط ہوا ہے یہ سب ہمارے اعمال کی وجہ سے ہے۔ عمل ٹھیک کرنے ہونگے۔ اللہ کس عمل سے خوش ہوتا ہے یہ سمجھنا ہوگا۔ اللہ کے کلام قرآن مجید کو سمجھنا ہوگا۔ اللہ کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے اور احادیث مبارکہ کو سمجھنا ہوگا۔ اصحابہ کرامؓ اور انؓ کی زندگیوں کو سمجھنا ہوگا۔ بزرگان دین کی محنت اور اخلاص کو سمجھنا ہوگا۔ ان تمام رستوں کو سمجھنا ہوگا تو پھر آپ کو خود پتہ چل جائے گا کہ کون سا راستہ ٹھیک اور کونسا راستہ غلط ہے۔ اللہ رب العالمین ہے صرف رب المسلمین نہیں۔ وہ تو انس و جنس، آسمان و زمین، پرندوں اور مچھلیوں، چرندوں اور خونخوار جانوروں سب کا رب ہے۔

کون ان بے دین لوگوں کو دین کی دعوت دے گا؟ ہمیں چاہیئے کہ ہم ان لوگوں کو اللہ اور اُس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے کا بتائیں۔ زبان اور عمل سے ان کو دین اسلام کی طرف راغب کریں جو اس راستے سے بے خبر ہیں۔ اور اگر وہ نہ مانیں یا اللہ اور اس کے رسولؐ کے دین کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کریں تو پھر اور بہت سے راستے ہیں جن میں ایک راستہ جہاد کا ہے۔

مولانا صاحب کی ان باتوں نے طالب پر گہرا اثر کیا۔ آنسو آنکھوں سے جاری ہوئے۔ وہ آہستہ آہستہ منبر کی طرف بڑھنے لگا، وہاں پہنچ کر اُس نے مولانا صاحب کو اپنی طرف متوجہ کیا کہ؛ مولانا صاحب! میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

کیسی بات بیٹا؟ مولانا صاحب نے بھی اپنی بات کاٹ دی اور طالب کی طرف متوجہ ہوا۔

طالب نے آہستہ سے اپنے اوپر ڈالی ہوئی چادر ہٹائی۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ یہ تو خودکش حملہ آور ہے تو چیخ و پکار کے ساتھ ہی مسجد میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔ کوئی کس طرف تو کوئی کس طرف بھاگنے لگا۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دینے اور گرانے لگے۔ ایک ایسا شور برپا ہوا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ لیکن مولانا اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔

طالب چیخنے لگا کہ؛ رکو مت بھاگو۔۔۔ میں دھماکہ نہیں کرونگا۔۔۔ رکو۔۔۔ میں آپ لوگوں کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔۔۔ رکو۔۔۔۔ میری بات سنو۔۔۔ پولیس کو اطلاع کرو۔۔۔ بات سنو۔

لیکن مسجد میں اتنا شور تھا کہ ساتھ کھڑا شخص بھی دوسرے شخص کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔ ہر کسی کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ مولانا صاحب سمجھ گیا کہ یہ جوان دھماکہ نہیں کرنا چاہتا تو انہوں نے لاؤڈ سپیکر میں آواز دینی شروع کی کہ؛ رک جاؤ۔۔۔ مت بھاگو۔۔۔ بات سنو۔۔۔ مت بھاگو۔

لوگ بھی مولانا صاحب کی بات پر کھڑے ہوگئے لیکن بہت کم۔ طالب نے اپنی بات کہنی شروع کی۔

مجھ پر اس محترم مولانا صاحب کی باتوں نے اثر کیا، ورنہ میں کب کا دھماکہ کرچکا ہوتا۔ مجھے مدرسہ میں یہ باتیں نہیں بتائی گئی تھی جو باتیں میں نے آج مولانا صاحب کے منہ

سنی۔ میرے دماغ میں یہ بات ڈالی گئی تھی کہ آپ سب لوگ کافر ہیں۔ مسلمانوں مجھے معاف کرو۔ اب میں وہاں دوبارہ نہیں جاسکتا جہاں سے آیا ہوں۔ میں اپنے آپ کو حکومت کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔

طالب کی باتیں جاری تھیں کہ پولیس وہاں پہنچ گئی۔ طالب کو گاڑی میں بٹھا کر خدا جانے کہاں لے گئے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ایک کالی کوٹھڑی میں طالب پولیس کے دو بڑے افسروں کے سامنے بیٹھا اُن کے سوالات کا جواب دے رہا تھا۔

پہلا شخص؛ تمھارا لیڈر کون ہے؟

طالب؛ مجھے پتہ نہیں۔

دوسرا شخص؛ تمھیں اس کام کا کس نے کہا؟

طالب؛ ملا نازک۔

پہلا شخص؛ ملا نازک کون ہے؟

طالب؛ وہ ہمارے مدرسہ میں ہمیں درس دیتا ہے۔

دوسرا شخص؛ تم لوگوں کا مدرسہ کہاں ہے۔

طالب؛ ہمارے گاؤں میں، یعنی چوہدری کے گاؤں میں۔

پہلا شخص؛ اور کون کون تمھارے ساتھ ہیں؟

طالب؛ نام کا پتہ نہیں لیکن دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔

دوسرا شخص؛ ملا نازک کہاں کا ہے؟

طالب؛ وہ کچھ مہینے ہوئے ہمسایہ ملک سے آیا ہے۔

پہلا شخص؛ اس سے پہلے کتنے دھماکے کیے ہیں؟

طالب؛ تین۔

دوسرا شخص؛ تم نے کیوں دھماکہ نہیں کیا؟

طالب؛ اس سے پہلے مجھے حقیقت کا پتہ نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس ملک یعنی ہمارے ملک کے لوگ کافر ہیں اور کافر کو قتل کرنا نیک کام ہے۔ اس کو جہاد کہتے ہیں اور جس کے بدلے میں جنت ملے گی۔

دوسرا شخص؛ اب تمھارا کیا خیال ہے؟

طالب؛ اب مجھے حقیقت کا پتہ چل گیا کہ کافر کون ہے اور مسلمان کون

پہلا شخص؛ تمھارا نام کیا ہے؟

طالب؛ میرا نام "فدا" ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

کرائے کی پتلون

سارے دن کی تھکاوٹ اُس کے چہرے پر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ چہرے کا رنگ پیلا، خشک ہونٹ، آنکھیں تھوڑی کھلی اور تھوڑی بند، ایک وحشت تھا اُس کے چہرے پر۔ اب بھی سر کے ایک حصے سے خون آہستہ آہستہ ٹپک رہا تھا۔ کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو اُسے سڑک کے بیچ سے اُٹھا کر اک سائیڈ پر رکھتا۔ ہسپتال لے جانے کا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے کہ ایکسڈنٹ کا معاملہ تھا، وہاں ہسپتال میں پولیس کی پوچھ گچھ، اور ڈاکٹروں کے اپنے گیت۔ جو بھی دیکھتا تو ایک ہی بات کہتا،،،، اُف کیسا جوان ہے۔

یہ تو ہر کوئی کہہ رہا تھا لیکن اُٹھانے کا کوئی بھی سوچ نہیں رہا تھا۔ سڑک بلاک تھی، لوگوں کا مجموعہ اکٹھا ہوا تھا۔ مگر صرف تماشے کیلئے۔

صبح سویرے فیروز شیشے کے سامنے کھڑا اپنے بال بنا رہا تھا کہ زرینہ اُس کے کمرے میں داخل ہوگئی۔

واہ لالا! ماشااللہ بہت خوبصورت لگ رہے ہو۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔

آمین، زرینہ بہن۔

لالا! کہاں کی تیاری ہے اور یہ پتلون کہاں سے ملی؟

جا رہا ہوں آج ایک جگہ نوکری کیلئے انٹرویو ہے۔ دعا کرو کہ کامیاب ہو جاؤں پھر بابا کے علاج کا بندوبست بھی ہو جائے گا اور تمھاری فرمائشیں بھی پوری ہو جائے گی۔

اللہ آپ کو کامیاب کرے۔ ہاں! یہ لیں آپ کی چائے اور جاتے ہوئے ایک بار بابا سے ضرور ملنا۔

شکریہ، ٹھیک ہے ملتا ہوں۔ فیروز نے چائے کا کپ زرمینہ سے لیا اور یہ بات کہہ دی۔

فیروز جب آئینے سے ذرا ہٹا، چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ دیوار پر لگی گھڑی پر نظر پڑی، ایک دم سے چائے کا کپ پاس رکھے ٹیبل پر رکھا اور جلدی جلدی بوٹ پہنے، فائل کو ربغل میں دبا کر کمرے سے نکل کر باپ کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ باپ کے کمرے میں ایک پرانی چارپائی پڑی تھی جس پر اُس کا بوڑھا بیمار باپ لیٹا تھا۔ فیروز نے باپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چُوما۔

بابا! میرے لیے دعا کریں۔ آج میرا انٹرویو ہے، بہت اچھی نوکری ہے۔ آپ دعا کریں کہ میں کامیاب ہو جاؤں۔

بیچارے بوڑھے بیمار باپ نے اشارے سے دعا کیلئے ہاتھ اُٹھائے۔ فیروز جلدی سے اپنے باپ کا ہاتھ چھوڑ کر دروازے کی طرف روانہ ہوا۔ بہن زرمینہ نے پیچھے سے آواز دی کہ؛ لالا! رُک جاؤ نظر تو اتاروں آپ کی۔

فیروز نے جلدی سے جواب میں کہا کہ؛ نہیں زرمینہ، دیر ہو رہی ہے گاؤں کی بس نکل جائے گی۔

بہن بیچاری جب دروازے تک گئی تو فیروز جا چکا تھا۔

فیروز اور زرمینہ ایک بہن بھائی تھے۔ ماں بیچاری خدا بخشے پچھلے سال وفات پا چکی تھی۔ باپ بیچارہ پچھلے چار سال سے بستر سے لگا ہوا تھا۔ کوئی افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک چوکیداری کی کچی نوکری تھی وہ بھی بیماری کی وجہ سے ہاتھ سے نکل گئی۔ بہن زرمینہ عورتوں

کے کپڑے سیتی اور گھر بمشکل چلاتی۔ فیروز بہت ہی قابل جوان تھا۔ اُس نے انگریزی میں ماسٹر کیا تھا۔ صبح نوکری کی تلاش میں نکلتا اور شام کو گاؤں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا۔ ٹیوشن کے پیسوں سے باپ کا علاج کرتا۔ کچھ دنوں پہلے ایک اخبار میں نوکری کا اشتہار لگا تھا۔ فیروز نے اس نوکری پر اپنے کاغذات جمع کرائے۔ پچھلے دن گاؤں کے خان کے گھر کے پتے پر فیروز کو انٹرویو کیلئے لیٹر آیا۔ اُس نے کسی کو بھی اس نوکری کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ بس آج صبح اُس نے اپنی بہن زرمینہ اور اپنے والد سے اس کے بارے میں کہا۔

فیروز جیسے ہی گھر سے نکلا تو گاؤں کا بس لوگوں سے بھرا پہنچ گیا۔ فیروز بھی بس کی سیڑیوں پر لٹک گیا اور بس شہر کی طرف روانہ ہوا۔

تقریباً ۹ بجے بس شہر پہنچی۔ فیروز کا انٹرویو ۱۰ بجے تھا۔ وہ نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ایک منٹ بھی لیٹ ہو۔ خیر وہ دفتر کے سامنے بیٹھ گیا۔ انتظار کرتے کرتے ۱۰ بج گئے۔ دفتر سے ایک چپڑاسی نکلا اور اُسے اندر لے کر گیا۔ ۱۵ منٹ کے بعد فیروز واپس دفتر سے نکلا۔ چہرے پر پریشانی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے ایک طرف کو چل دیا۔ اپنے ڈگریاں ایک ایک کر کے فائل کور سے نکال کر اُسے پھاڑتا اور پھینکتا گیا۔ آخر تمام ڈگریاں ختم ہو گئیں۔ فائل کور کو بھی ایک طرف پھینک دیا۔ کرب، پریشانی اور بے بسی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھتا رہا اور اپنی سوچوں میں آگے بڑھتا رہا۔ نا انصافیوں کے ترازو میں اپنی خوشیوں کے ماتم میں کبھی وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا تو کبھی سر پر رکھتا۔ اپنی نوکری کا کسی اور کی جھولی میں جاتا دیکھ کر خود کے تمام خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ جو وہ بڑے مان سے اپنے ساتھ گاؤں سے لایا تھا۔ حالت اس کی بگڑ رہی تھی، شرٹ کے بٹن کھولے، یوں لگ رہا تھا کہ اُس کا دم گُٹ رہا ہو۔ انھی سوچوں میں تھا کہ اچانک ایک طرف سے تیز رفتار گاڑی آئی اور اُسے ٹکر مار کر آگے نکل گئی۔ فیروز کا سر اور

کاندھا گاڑی کے ایک سائیڈ کا ساتھ زور سے لگا۔ وہ سیدھا سڑک پر آ گرا اور موقع پر ہی اس کا دم نکل گیا۔

گاڑی والا ایک منٹ کے لیے بھی نہ رُکا۔ لوگ جمع ہو گئے، کوئی کیا تو کوئی کیا کہہ رہا تھا۔ لیکن ایک بات جو سبھی کہہ رہے تھے وہ یہ تھی کہ،،،، اُف کیسا جوان ہے۔

انہی لوگوں میں اُس کے گاؤں کا ایک جوان اور اُس کے شہر کا دوست بھی یہ دیکھنے آیا کہ ماجرہ کیا ہے۔ جیسے ہی جوان کی نظر فیروز پر پڑی تو بے اختیار منہ سے نکلا کہ؛ یہ تو فیروز ہے۔ ساتھ والے دوست نے پوچھا کہ؛ کیا تم اسے جانتے ہو؟

ہاں یہ میرے گاؤں کا ہے۔ رات یہ میرے گھر آیا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ تمھاری پتلون مجھے کرائے پر چاہیئے، کل میں ایک جگہ جا رہا ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆

چُڑیل

وہ پاگل نہیں تھی، نہ وہ یہ جان بوجھ کر رہی تھی اور نہ ہی وہ چُڑیل تھی۔ یہ تو لوگوں نے اُس پر چُڑیل کا نام رکھا تھا۔ اس لیے کیوں کہ وہ بہت باحیا اور باپردہ تھی۔ اتنے کم عمر میں اتنی خوبصورت، گھر کی واحد دوشیزہ تھی۔ ماں اُس کے بچپن ہی میں گزر چکی تھی۔ باپ بیچارے کو دن بھر دو ہاتھوں کی روزی روٹی کمانے میں رات ہو جاتی۔ ماہ گل گاؤں کی سب سے زیادہ خوبصورت اور حسین لڑکی تھی۔ ۱۳ سال کی عمر میں ہی ماہ گل کیلئے چھ رشتے آئے تھے۔ حالانکہ اس وقت وہ بہت چھوٹی تھی۔

ماہ گل سے باپ بہت پیار کرتا تھا۔ کیوں نہ پیار کرتا، وہ تو زعفران چاچا کی اکلوتی بیٹی اور اس کے دل کا ٹکڑا تھی جو بڑی ناز و نخرو سے جوانی کے دہلیز تک پہنچی تھی۔ باپ زعفران چاچا ماہ گل کیلئے آئے ہوئے رشتوں سے بہت پریشان تھا۔ گاؤں کے اچھے اچھے گھرانوں کے رشتے آئے تھے۔ اچھے اچھے جہیز دے رہے تھے۔ لیکن زعفران چاچا ہر کسی کو یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ ماہ گل ابھی تک بچی ہے۔ مگر پھر بھی زعفران چاچا ماہ گل کی خوبصورتی اور جوانی سے پریشان تھا۔

ایک دن زعفران چاچا جو بہت ہی سیدھا سادہ اور ہر کام کرنے سے پہلے مولوی سے مشورہ ضروری سمجھتا، گاؤں کے مولوی جو مولوی صوفی کے نام سے مشہور تھا کے پاس گیا اور اپنی پریشانی یوں بیان کی کہ؛

مولوی صاحب! میری بیٹی خیر سے جوان ہو گئی ہے، میں سارا دن کام کاج کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا ہوں۔ بیٹی کیلئے چھ رشتے آئے ہیں، وہ میرا چچازاد یونس کہتا ہے کہ میں دوسری شادی کر لوں، آپ مجھے کوئی نیک مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔ بہت پریشان ہوں۔

مولوی صوفی نے اُس کی بات کو غور سے سنتے ہوئے، کچھ سوچنے کے بعد کہا کہ؛

زعفران چاچا! بات تو واقعی پریشانی کی ہے۔ لیکن اللہ کے فیصلے بھی تو ماننے ہوں گے یا نہیں؟ آج یا کل، بیٹی کی شادی کرانی ہوگی، ساری زندگی تو اُسے گھر پر نہیں بٹھا سکتے؟

مولوی صاحب! میں بھی اسی بات کیلئے آپ کے پاس لایا ہوں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ آپ ہی بتائیں کہ کیا کروں۔ میں دوسری شادی کروں یا پہلے اپنی بیٹی کی شادی کروادوں؟

آپ ایسا کریں کہ کل صبح میرے پاس تشریف لائیں، میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال دونگا۔

ٹھیک ہے مولوی صاحب۔ آپ کا بہت شکریہ، تو میں چلتا ہوں، اللہ حافظ۔

جاؤ، اللہ حافظ۔ مولوی صاحب نے بھی جواب میں کہا۔

ماہ گل کی خوبصورتی پورے گاؤں میں مشہور تھی۔ گاؤں کے جوان چاہتے کہ ماہ گل کا ایک دیدار کرے، اور اُس کی خوبصورتی پر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ گاؤں کی لڑکیاں چاہتی کہ ماہ گل اُن کی سہیلی بن جائے لیکن ماہ گل کو کسی کی بھی پرواہ نہ تھی۔ وہ اپنے باپ جو سارا دن محنت مزدوری کرتا اُس کی خدمت میں لگی رہتی۔ ماہ گل بہت ہوشیار اور باحیا تھی۔ لیکن اُسے اپنے آنے والے کل کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اگر پتہ تھا تو صرف اس بات کا کہ باپ کی خدمت کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔

کبھی کبھار رات کے وقت جب زعفران چاچا سو جاتا تو ماہ گل اپنے بستر پر لیٹی ماں کی سنائی ہوئی وہ تمام کہانیاں یاد کرتی جو اُسے بچپن میں سنائی گئی تھی۔ یعنی ایک خوبصورت شہزادے کی، چالاک لومڑی، عادل بادشاہ، اور چُڑیل کی۔ ماہ گل کو یہ تمام کہانیاں یاد تھی۔ وہ خیالوں میں اکثر سوچتی کہ وہ ایک شہزادی ہے یا پری ہے اور کالے دیو کے قید میں ہے۔ ایک دن ایک شہزادہ آکر کالے دیو کو مار کر اُسے کالے دیو کے قید سے آزاد کرائے گا اور اپنے ساتھ ایک خوبصورت محل میں لے جائے گا۔ یہ کہانیاں اُس کی زندگی کا کل اثاثہ تھیں۔ ماہ گل بہت بااحساس تھی، اُسے ہر وقت اپنے باپ کی فکر لگی رہتی۔

صبح سویرے زعفران چاچا مولوی صاحب کے پاس گیا۔ مولوی صاحب بھی اس طرح تیار ہوا تھا جیسے ۲۰ سالہ جوان ہو۔ زعفران چاچا نے جب مولوی صاحب کو دیکھا تو مسکرا کر کہا کہ؛

مولوی صاحب! آج تو آپ بالکل جوان لگ رہے ہیں۔

مولوی صاحب نے جواب میں کہا کہ؛

میں تو ہوں جوان، بس اس نامراد زکام نے کچھ بال سفید کر دیے ہیں، اصل میں میری عمر ہوگی یہی ۳۰ یا پھر کچھ اُوپر۔

زعفران چاچا کچھ سوچ میں پڑ گیا پھر جلدی سے اپنے مقصد کی طرف آیا اور مولوی صاحب سے پوچھا کہ؛

میرے کام کا کیا بنا مولوی صاحب؟

جناب اگر میں آپ کو ایک نیک مشورہ دوں تو کیسا رہے گا؟

تو پھر کیا؟ نیک کام کیلئے تو آیا ہوں۔

دیکھو زعفران چاچا! آج کل کے نوجوان خاص کر تو کالج والے، یہ تو کسی چیز کی خبر نہیں رکھتے۔ بد اخلاق، بد عمل، داڑھی مونچھ مُنڈائے، بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں، ہر چیز میں ٹانگ اڑانا، ان جوانوں کا رواج بن گیا ہے۔ کہاں ہم جیسے عالم فاضل، اللہ کے راستے سے باخبر، مسجد کے ساتھ محبت، قرآن اور حدیث کے راستے پر چلنے والے۔ یہ آج کل کے نوجوان کہاں کر سکتے ہیں۔ میرا ایک مشورہ یہ ہے کہ ایک اچھے عالم فاضل شخص سے بیٹی کا رشتہ طے کر دو۔

یہ تو اچھی بات ہے، لیکن یہاں ایک مسئلہ ہے۔

کیسا مسئلہ ؟

وہ یہ کہ میں کہاں عالم فاضل کو ڈھونڈتا پھرونگا۔ اگر آپ یہ کر سکتے ہیں تو میں یہ ذمہ داری آپ کو سونپتا ہوں۔ آپ ایک اچھے حافظ قرآن یا عالم کو ڈھونڈ لیں میں بیٹی کا نصیب اُس سے جوڑ دیتا ہوں۔

زعفران چاچا! آپ جائیں، انشااللہ شام تک آپ کو اطلاع مل جائے گی۔

زعفران چاچا بھی خوشی خوشی گھر چلا آیا اور بیٹی کے اچھے نصیب کے متعلق سوچوں کے سمندر میں خود کو ڈبو دیا۔

وقت گزرتا گیا، شام ہوئی، دیکھتا ہے کہ زعفران چاچا کے گھر دو بزرگ شخص تشریف لائے۔ زعفران چاچا نے اُن دونوں بزرگوں کو گھر کے ایک کمرے میں بٹھایا، اُن دونوں میں سے ایک نے بات شروع کی۔

زعفران خان! جس کسی کے گھر میں جوان بیٹی ہو تو وہاں دوستی کے رشتے ضرور آتے ہیں۔ ہم بھی اسی بارے میں یہاں آئے ہیں اور تم سے تمھاری بیٹی کا ہاتھ مولوی صوفی کیلئے مانگتے ہیں۔ مولوی صوفی بہت اچھے عالم ہیں اور ہمارے امامِ مسجد بھی ہیں۔

وہ تو ٹھیک ہے، مگر مولوی صاحب کی تو شادی ہو چکی ہے اور وہ پانچ چھ بچوں کا باپ بھی ہے اور تو اور وہ عمر میں مجھ سے بھی شاید پانچ چھ سال بڑا ہو گا۔ میری بیٹی اس وقت صرف ۱۴ سال کی ہے۔

دیکھو زعفران خان! آج کل کے نوجوانوں پر اعتبار کرنا بے عقلی ہے۔ مولوی صوفی بہت اچھا آدمی ہے۔

چاچا آپ کی بات سر آنکھوں پر، لیکن میں اپنی بیٹی کو آگ میں نہیں جھونک سکتا، میں تو مولوی صاحب کے پاس مشورہ کرنے گیا تھا، مجھے کیا پتہ تھا کہ خود اُس کی نظر میری بیٹی پر ہے۔ میری طرف سے انکار ہے آپ لوگ جاسکتے ہیں۔

دونوں بزرگ کچھ کہے بغیر اُٹھ کر چلے گئے۔ خدا جانے انہوں نے مولوی صوفی سے کیا کہا ہو گا۔

کچھ دنوں بعد ماہ گل بیمار پڑ گئیں۔ زعفران چاچا نے اسے اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا، لیکن بیماری دن بہ دن بڑھتی گئی۔ ماہ گل کو رات کے وقت نیند نہ آتی۔ جیسے ہی بستر پر لیٹتی دم گھٹنے لگتا۔ چیختی، چلاتی۔ ہمسایہ ماہ گل کی چیخوں سے تنگ آ گئے۔ ایسا وقت بھی آیا کہ وہ رات کو گھر سے نکل جاتی، پھر زعفران چاچا اُس کے پیچھے نکل کر اُسے کسی گلی کوچے میں پالیتا اور واپس گھر لے آتا۔ ماہ گل گلیوں میں چیختی چلاتی، تمام گاؤں کو خبر ہو گئی، گاؤں کے لوگوں نے اُسے کئی بار گلیوں میں پھرتے دیکھا تھا وہ بھی کھلے بال اور ننگے پاؤں۔

ماہ گل پورے گاؤں میں چڑیل کے نام سے مشہور ہو گئی۔ گاؤں کے نوجوان اب اُس کی حسن کی تعریف نہیں کرتے، بلکہ اُسے اُس کے نئے نام یعنی چُڑیل کے نام سے جاننے لگے تھے اور لڑکیوں نے تو اُس کے بارے میں مشہور کیا تھا کہ ماہ گل رات کے وقت قبرستان میں پھرتی ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں جھوٹ پر مبنی تھیں۔ اگر سچ تھا تو وہ یہ تھا کہ ماہ

گل رات کے وقت، کھلے بال، ننگے پاؤں قہقہے لگاتی ہوئی یا پھر روتی ہوئی گلی کوچوں میں مولوی صوفی کے گھر کی طرف، لیکن اپنے خیالی شہزادہ جمال کی خاطر بھاگتی نظر آتی۔

☆☆☆☆☆☆☆

عیاشی

پچھلی رات سے اپنے کمرے میں سوئے ہوئے عقیل کی آنکھ آج دوپہر کو کھلی۔ زیادہ نیند اور شراب کی وجہ سے آنکھیں سرخ تھیں۔ جب اُس کے دماغ نے کام کرنا شروع کیا تو اُسے کل کے تمام واقعات جلدی جلدی یاد آنے لگے۔ وہ زبیر کے گھر بنائے گئے پروگرام جس میں موسیقی، شراب، کباب اور شباب بہ یک وقت تھے یاد آنے لگے۔ عاقل کے ماتھے پر خوف کے پسینے کے چند قطرے دکھائی دینے لگے۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا اور اپنے آپ سے کہنے لگا کہ؛

فواد؟ فواد؟ فواد کو کیا ہوا؟ اور میں یہاں کیسے پہنچا؟

اسی بات پر حیران تھا کہ میں تو کل سارا دن زبیر کے گھر پر تھا اور شام تک وہی تھا۔ تو پھر یہاں کیسے پہنچا؟ کون مجھے یہاں لے آیا؟ اُسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ماجرہ ہے۔ عاقل انہی سوچوں میں تھا کہ گھر کے باہر کا دروازہ کسی نے کھٹکٹایا۔ عاقل کی ماں گھر کے صحن میں کھڑی کوئی کام کر رہی تھی اور اُس نے وہی سے آواز لگائی۔

کون ہے؟

ماں جی عاقل گھر پر ہے؟

ہاں گھر پر ہے۔

کہنا دوست بُلا رہے ہیں۔ باہر سے آواز آئی۔

ٹھیک ہے بُلاتی ہوں۔

عاقل نے جب دروازے کی کھٹکٹانے کی آواز سنی تو اپنے بستر سے اُٹھا، چپل پہنے، آہستہ آہستہ بھاری بھر کم سر کے ساتھ گھر کے صحن کی طرف روانہ ہوا۔ جب صحن میں پہنچا تو ماں نے اُس سے کہا کہ:

عاقل بیٹا! باہر تمھارے دوست کھڑے تمھیں بُلا رہے ہیں۔

کون ہیں؟ عاقل نے بیزاری سے پوچھا۔

پتہ نہیں کون ہیں، تم جا کر دیکھ آو، اور ہاں کہیں غائب مت ہو جانا، تمھارے ابا کے آنے کا وقت ہے۔

ٹھیک ہے ماں کہیں نہیں جاؤنگا۔

عاقل نے ماں کو جواب دیا اور گھر کا دروازہ کھولا۔ جیسے ہی دروازہ کھولا تو اچانک اُس کے منہ سے نکلا۔

کک، کیا چاہیئے؟

آپ چاہیئے ہو عاقل صاحب۔ چلو ہمارے ساتھ، آج آپ ہمارے مہمان ہو۔

عاقل کی آنکھیں خوف کے مارے باہر کو نکل آئی، زبان گونگ ہو گئی، گھبرا کر کہا۔

میں نے کچھ نہیں کیا، میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں چلونگا۔

کیسے نہیں چلتے، چلے گا تو تمھارا باپ بھی۔ اوئے دلبر اسے گاڑی میں ڈال دو۔

آئے ہوئے لوگ پولیس والے تھے۔ دلبر سپاہی اس حکم کی تعمیل کیلئے پہلے سے ہی تیار کھڑا تھا کہ جیسے ہی ایس ایچ او حکم دے اور وہ اپنا کام کرے۔

عاقل کو ایک بنیان شلوار میں گاڑی میں بٹھایا گیا۔ عاقل گاڑی میں بیٹھتے ہی چلانے لگا۔

میں نے کچھ نہیں کیا، مجھے کسی چیز کا علم نہیں، میں نے کچھ نہیں کیا۔

ماں نے بھی بیٹے کی چیخیں سُن لی۔ وہ بھی گھر سے باہر عاقل کے پیچھے نکلی مگر گاڑی جا چکی تھی۔ اور وہ اُسی طرح آنکھوں میں آنسو لیے گلی میں کھڑی رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد عاقل کا والد گھر آیا۔ خدا جانے کس نے اُسے اطلاع دی تھی کہ آپ کے بیٹے کو پولیس لے گئی ہے۔ عاقل کا والد ایک سرکاری محکمے میں بڑا آفسر تھا۔ فوراً پولیس اسٹیشن روان ہوا۔ جیسے ہی پولیس اسٹیشن پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ عاقل حوالات میں بیٹھا رو رہا ہے اور ساتھ ہی زبیر بھی حوالات میں بیٹھا ہے۔ ایس ایچ او نے عاقل کے والد کی اچھی عزت افزائی کی۔ اُس کے سامنے چائے پیش کی۔ عاقل کے والد نے ایس ایچ سے پوچھا کہ؛

ایس ایچ او صاحب! آپ جناب نے ان لڑکوں کو کس جرم کے تحت گرفتار کیا ہے؟

جناب! اگر میں نے آپ کو وہ بات بتائی جس کی وجہ سے یہ دونوں حوالات میں ہیں تو آپ کے رونگھٹے کھڑے ہو جائینگے۔

پھر بھی آپ بتائیں کہ بات کیا ہے؟

بات یہ ہے کہ وہ لڑکا آپ دیکھ رہے ہیں؟ ایس ایچ او نے زبیر کی طرف اشارہ کیا۔

جی، زبیر ہے، میں اسے جانتا ہوں، میرے دوست کا بیٹا ہے اور اچھا لڑکا ہے۔

اس اچھے لڑکے اور آپ کے بیٹے نے کل زبیر کے گھر پروگرام بنایا تھا، جس میں دونوں شراب، کباب اور شباب کے ساتھ پورا دن مستی میں مگن رہے۔

ایس ایچ او یہی باتیں کر رہا تھا کہ عاقل کے والد نے ایس ایچ او کی بات درمیان میں کاٹ لی۔

سر میں آپ کی بات سمجھ نہیں پارہا، آپ مجھے آسان الفاظ میں سمجھائیں۔

تو آسان الفاظ میں قصہ یہ ہے کہ یہ اچھا لڑکا یعنی زبیر اور آپ کا بیٹا کل ایک لڑکی زبیر کے گھر لے آئے تھے۔ جب ان دونوں نے اپنے ہوس کی آگ بجھادی تو دوپہر کو ایک دوسرے دوست فواد نامی کو بھی بُلالیا تاکہ وہ بھی آکر ہمارے اس پروگرام کو اور رنگین بنادے۔ جب فواد اپنی ہوس کی آگ بجھانے اُس لڑکی کے پاس گیا جو کہ گھر کے ایک دوسرے کمرے میں تھی تو اُس کی اچانک موت واقع ہوگئی۔ لڑکی کا دماغی توازن خراب ہے جو کہ ساتھ والے حوالات میں ہے۔ خود کے بال نوچتی ہے اور خود سے طرح طرح کی باتیں کر رہی ہے۔

عاقل کے والد نے پھر بات کاٹ لی اور کہا کہ؛

سر آپ کو یہ باتیں کس نے کہی؟

ہمیں یہ باتیں خود زبیر نے کہی ہے۔ آپ کے بیٹے کے متعلق بھی زبیر نے بتایا ہے کہ وہ کل سارا دن اُس کے ساتھ اس پروگرام میں شریک تھا۔ زبیر کے گرفتار ہونے سے پہلے ہمیں محلے والوں نے اطلاع دی کہ حاجی صالم کے گھر میں صبح سے میوزیک بج رہا ہے اور ابھی ایک ایمبولینس آکر رُکی ہے اور جس میں ایک لڑکے کو ہسپتال لے جایا گیا ہے۔ ہم جب جاہ وقوعہ پر پہنچے تو ہم نے ایک لڑکی بر آمد کی جس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ پھر ہم ہسپتال گئے وہاں آپ کا بیٹا نہیں تھا صرف زبیر تھا جو کہ فواد کی لاش کے ساتھ تھا۔ ہم نے زبیر کو وہی سے گرفتار کیا۔

تو آپ کا کیا خیال ہے کہ قتل انہی دونوں نے کیا ہے؟ عاقل کے والد نے پوچھا۔

نہیں، نہیں قتل ان دونوں نے نہیں کیا، بلکہ فواد تو ہارٹ اٹیک کی وجہ سے مرا تھا۔

جب فواد ہارٹ اٹیک کی وجہ سے مرا ہے تو آپ نے ان دونوں کو کیوں گرفتار کیا؟ عاقل کے والد نے پھر پوچھا۔

اس گرفتاری کی وجہ یہ ہے کہ فواد برآمد شدہ لڑکی کا بھائی تھا۔ فواد کو پتہ نہیں تھا کہ زبیر اور عاقل نے میرے لیے میری بہن کو عیاشی کیلئے بیٹھا رکھا ہے۔ فواد نے جب اپنی بہن کو دیکھا اُسی جگہ شرم کے مارے ہارٹ اٹیک ہوا اور بہن نے جب فواد کو دیکھا تو خوف اور صدمے سے پاگل ہو گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆

مصور

کمرے کی دیواروں پر چاروں طرف ہاتھ سے بنے پینٹنگز لگے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کمرے کی دیواریں پینٹنگز سے بنائی گئی ہوں اور کمرے کا چھت ان پینٹنگز پر کھڑا ہے۔ کمرے میں ۳۵ سالہ روفی ہاتھ میں برش اور میکسنگ پلیٹ لیے ہر چیز سے بے خبر اپنی دنیا میں گم، اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا، رنگوں کے سمندر سے اپنے مطلب کے رنگ منتخب کرتا اور اپنے خیال کو تصویر کا جامہ پہنا رہا تھا جس کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مگن تھا کہ اُسے آس پاس کے ماحول کا کچھ خیال ہی نہ تھا کہ ڈاکٹر شیر آدھے گھنٹے سے پیچھے کھڑا اُس کی تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا اور اُس میں حقیقی چہرہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ روفی اس تصویر پر پچھلے چار دنوں سے کام کر رہا تھا۔ اس تصویر میں ایسی کیا بات تھی جس کی وجہ سے روفی اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے خبر تھا۔

یار مجھے اس کی ایک آنکھ ٹیڑھی نظر آ رہی ہے۔ ڈاکٹر شیر نے سکوت کا ماحول طنزیہ بات سے تھوڑ دیا۔

ہاں، کیا، آپ، آپ کب آئے؟

روفی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا اور اپنے خیالی دنیا سے باہر آیا۔

ہاں میں۔

آجائیں ڈاکٹر صاحب، میرے نزدیک اس کرسی پر بیٹھ جائیں۔ روفی نے قریب رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

یار روفی! مجھے ایک بات تو بتاؤ؟ اگر میں نے تمھارا حال احوال پوچھا تو ٹھیک، ورنہ تم نے تو حال احوال نہ پوچھنے کی قسم کھائی ہے۔ ڈاکٹر نے بیٹھتے ہوئے روفی سے شکایت کی۔

ڈاکٹر صاحب! معذرت چاہتا ہوں، مصروفیات کچھ زیادہ ہیں، ویسے میں آپ کا حال احوال نہ پوچھوں یہ تو ہو نہیں سکتا۔ روفی نے مسکرا کر جواب دیا اور میکسنگ پلیٹ اور قلم ایک طرف رکھ کر ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

مصور صاحب! اس دنیا سے نکل کر ذرا باہر کی دنیا کو دیکھیں، گھر سے نکل کر ذرا دیکھیں کہ کہ اس دنیا کے خالق نے کیسے کیسے تخلیقات کیے ہیں۔ تم اس کمرے سے جس میں دن رات بیٹھ کر تم تصویریں بنا رہے ہو باہر کی دنیا کو دیکھو۔ ڈاکٹر نے نصیحت بھرے لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر صاحب! ضرور نکلو نگا، بس مجھے یہ تصویر بنانے دو، پھر تم جہاں کہو گے میں تمھارے ساتھ چلو نگا۔ روفی نے جواب میں کہا اور آنکھیں اُس تصویر پر جمائی جس میں ایک عورت کا عکس کچے رنگوں سے بنا بغیر دوپٹے کے، آنکھوں سے چہرے پر گرتے آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے، لیکن چہرے پر مسکراہٹ کینوس پر تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔

یار روفی! تم اپنے فن پاروں کی ایگزی بیشن کیوں نہیں کرتے؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔

ایگزی بیشن؟ یار یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اور دوسری بات کہ میں اپنے فن پارے کسی اور کو نہیں دکھانا چاہتا۔ یہ میں نے خود کیلئے بنائے ہیں، دوسروں کے لیے نہیں۔

دیکھو روفی! اگر تم ان فن پاروں کی ایگزی بیشن کرو گے تو تم پورے دنیا میں جانے جاؤ گے۔ اور ساتھ ہی ساتھ، تمھاری مالی مشکلات بھی ختم ہو جائینگے۔ کب تک دوسروں کے جیب پر گزارہ کرو گے۔

ڈاکٹر صاحب، تم کیوں نہیں سمجھتے، مجھے اس طرح کے کام پسند نہیں۔ اور رہی جیب خرچ کی بات، تو تم بے فکر رہو، میں آئندہ تم سے نہیں کہونگا۔

یار تم تو سنجیدہ ہو گئے، اور تمھاری زبان پر یہ بات کیسے آئی کہ تم مجھے نہیں کہو گے۔ بس اتنی یاری؟

او ہو، تم پھر نصیحت کے گھوڑے پر بیٹھ گئے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے اپنی دنیا سے مت نکالو، باہر کی دنیا کے لوگوں کو میرا چہرہ مت دکھاؤ، میں اس دنیا میں بہت خوش ہوں۔ روفی نے ارد گرد کی دیواروں پر لگے پینٹنگز کو دیکھا اور یہ بات کہی۔

روفی صاحب! خدا نہ کرے اگر تم فوت ہو گئے تو اس باہر کی دنیا کے لوگ آکر تمھیں باہر کسی قبرستان میں لے جاکر دفن کر دینگے۔ باہر کی دنیا سے چھپنا ناممکن ہے۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو، تم مجھے ٹرخا سکتے ہو، لیکن باہر کی دنیا کو نہیں ٹرخا سکتے۔

تم ڈاکٹر اور میں مصور۔ چلیں ڈاکٹر صاحب، جیسی آپ کی مرضی۔ لیکن تمام خرچہ آپ پر۔ روفی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

تو پھر منظور ہے۔ تمام خرچہ، جگہ اور مہمانوں کا بندوبست مجھ پر، صرف تم اور تمھاری تخلیقات وہاں حاضر ہونی چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب! ایک بات کہوں؟

کہو۔

ڈاکٹر صاحب! میں لوگوں کے پوچھے گئے سوالوں کے جوابات دینے کی ہمت نہیں رکھتا، کیونکہ میں نے لوگوں کے ساتھ زندگی نہیں گزاری۔ آپ ایسا کریں کہ یہ ساری تخلیقات اپنے ساتھ لیں جائیں، پروگرام کریں، میری طرف سے تمام اختیار آپ کے۔

یہ تو ٹھیک بات نہیں۔ ڈاکٹر نے کہا۔

ٹھیک ہو یا غلط۔ مجھے اور تنگ مت کرو۔ روفی اپنی بات پر ڈٹ گیا۔

ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم دیکھنا میں تمھاری تخلیقات اور تمھیں کہاں پہنچاتا ہوں۔

کچھ دنوں بعد ایک شاندار مقامی ہوٹل میں روفی کے فن پاروں کی نمائش جاری تھی۔ بہت بڑی تعداد میں مرد و خواتین اس نمائش کو دیکھنے آئے تھے۔ حکومتی لوگ جن میں فوج کے اعلیٰ افسران، ڈاکٹرز، آفیسرز وغیرہ کی بڑی تعداد یعنی ہر طبقہ فکر کے لوگ موجود تھے۔

بہت اعلیٰ، بہت ہی خوبصورت، یہ پینٹنگ تو واقعی بہت ہی کمال کی بنائی گئی ہے۔

ہاں بہن، یہ تصویر واقعی بہت ہی صفائی سے بنائی گئی ہے۔ بہت ہی شاندار تخلیق ہے۔ چلیں آگے دیکھتے ہیں کہ کیا ہے۔

دو پختہ عمر کی عورتیں جو کہ غالباً پچاس سالہ ہونگی ایک تصویر کے سامنے کھڑی یہ باتیں کر رہی تھیں۔

میڈم ماہ جبین! یہ تصویر آپ کی نہیں ہے؟ ایک عورت نے دوسری عورت سے کچھ حیرانی میں پوچھا۔

ہاں واقعی۔ اس تصویر میں تو میں ہوں۔ اس مصور نے مجھے کہاں دیکھا ہے جو میری تصویر بنائی ہے۔ میڈم ماہ جبین نے حیران ہو کر پوچھا۔

میڈم! آپ شہر کی مئیر کی بہن ہیں۔ ہو سکتا ہے کہیں آپ کو دیکھا ہو۔ دوسری عورت نے جواب میں کہا۔

ہو سکتا ہے، مگر اتنی صفائی سے کیسے بن سکتا ہے۔ تم چلو ڈاکٹر شیر سے اس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

چلیں۔

ڈاکٹر شیر کو لوگوں میں ڈھونڈتے ہوئے، اُسے اس تصویر کے پاس لے آئی اور تصویر کے سامنے کھڑا کر دیا جو کہ ماہ جبین میڈم کی شکل سے کافی ملتی جلتی تھی۔ ڈاکٹر نے جب تصویر دیکھی اور پھر ماہ جبین میڈم کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔

یقین نہیں آرہا، آپ کے خیال میں اُس نے آپ کو کہاں دیکھا ہو گا؟

میں کیا کہہ سکتی ہوں کہ کہاں دیکھا ہو گا؟

محترمہ، یہ اتفاق ہے۔ وہ اس لیے کہ میرا یہ دوست اپنے کمرے سے بالکل بھی نہیں نکلتا۔ اُس کے کام کے اوزار اور رنگ وغیرہ میں ہی اُس کیلئے بازار سے لے آکر آتا ہوں۔ ڈاکٹر نے جواب میں کہا۔

اگر یہ اتفاقیہ ہے تو پھر آپ مجھے اُس کے گھر کا پتہ اتفاقاً دیں۔ میں خود جا کر اُن سے اتفاقاً پوچھ لوں گی۔ میڈم ماہ جبین نے کہا۔

میڈم آپ مجھے کل تک کا وقت دیں، میں اُن سے اجازت لے کر آپ کو مطلع کرتا ہوں۔ ڈاکٹر نے سوالیہ انداز میں جواب دیا۔

اجازت پھر کیوں؟

وہ لوگوں سے نہیں ملتا، آپ نہیں دیکھ رہی اتنے بڑے پروگرام میں وہ موجود نہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے۔

ٹھیک ہے، تمھارے پاس کل تک کا وقت ہے، اب آپ ایسا کریں کہ یہ تصویر پیک کر کے میرے گھر بجھوا دیں اور ہاں اس کی قیمت کیا ہے؟

اس کی قیمت میں ابھی لسٹ میں دیکھ کر آتا ہوں۔

ٹھیک ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے لسٹ میں قیمت دیکھ کر ایک نوجوان کو تصویر پیک کرنے کا کہا۔

روفی یار! قسم سے بالکل مئیر کی بہن کی تصویر بنائی تھی تم نے۔ اُسے بھی بہت پسند آئی اور میں نے بھی پچاس ہزار کا دے دیا۔ ڈاکٹر روفی کو نمائش کی کارگزاری بیان کر رہا تھا۔

اچھا، یہ کیسا اتفاق ہے، حالانکہ میں نے والی کی بہن کو تو کیا آج تک والی کو بھی نہیں دیکھا۔

یار وہ تمھارا پتہ مانگ رہی تھی، میں نے نہیں دیا، دوں کیا؟

نا، نا، نا، خیال کرنا یہ غلطی نہ کر بیٹھنا۔

تو پھر کیا جواب دوں؟

کہنا کہ وہ یہ شہر چھوڑ کر پتہ نہیں کونسے شہر چلا گیا ہے۔

ابے اوئے پگلے! وہ مئیر کی بہن ہے، کہیں سے اور کسی بھی غار سے نکال سکتی ہے۔

بس آپ میرا پتہ نا دیں۔

ٹھیک ہے یار، اب تو اس خوشی میں ایک اچھی دعوت کا حق رکھتا ہوں، یار دو لاکھ کما کر لایا ہوں تمھارے لیے۔

کیوں نہیں، جدھر جی چاہے وہی چلتے ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد روفی رنگ وغیرہ لینے بازار گیا۔ کپڑے کی دکان پر گیا تا کہ کچھ کپڑا خرید سکے۔ جب وہ کپڑے کی دکان میں کپڑا خرید رہا تھا تو ساتھ کھڑی ایک نوخیز لڑکی جو کپڑا خرید رہی تھی پر اچانک نظر پڑی۔ عمر میں تو یہ لڑکی تقریباً تیرا، چودہ سال کے قریب تھی۔ اس طرح کا حسن وجمال اُس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ سیاہ بڑی خوبصورت آنکھیں، گلابی نازک ہونٹ، روفی اس پیکر مجسم کو دیکھتا رہ گیا اور دل ہار بیٹھا۔ وہ جو اُس کا ایک

سپنا تھا کہ ایک ایسی تخلیق بناؤں جو اُس کی زندگی کی ایک شاہکار تخلیق ہو، پورا ہونے کو تھا۔ غضب کا تخلیقی دماغ پایہ تھا۔ جس چیز کو ایک نظر دیکھتا فوراً دماغ میں سکیچ بنالیتا۔

لڑکی کپڑا خرید کر دکان سے نکلی اور ایک طرف روانہ ہوئی۔ روفی بھی اُس کے پیچھے ہولیا۔ لڑکی گلی کے ایک خوبصورت گھر کے سامنے رُکی، گھر کی گھنٹی بجائی۔ روفی بھی کچھ دور کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کا دھیان روفی کی طرف نہیں تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا، لڑکی اندر داخل ہوئی اور روفی کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ روفی اپنا ہارا ہوا دل لیے واپس اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

گھر پہنچتے ہی جلدی جلدی اپنے اوزار برابر کیے، کینوس پر کپڑا لگایا، اور خود سٹینڈ کے سامنے کرسی پر، رنگ برنگے کلرز ساتھ ٹیبل پر رکھ کر اپنی زندگی کا سپنا سچ کرنے بیٹھ گیا۔

کچھ دنوں بعد ڈاکٹر شیر اُس کے ہاں آگیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ روفی ایک نئے تخلیق میں مگن ہے اور اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے خبر رنگوں کا جادو بکھیر رہا ہے۔

یار روفی! وہ بضد ہے کہ مجھے تمھارا پتہ بتاؤ۔ میں آخر کیا کروں۔ میں تو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہا ہوں۔ اور ایک تم ہو کہ ہاں نہیں کرتے۔

ڈاکٹر صاحب، خیال کرنا اُس کی طرف نہ ہو جاؤ، میری طرف ہو جاؤ، منافع میں رہو گے۔ روفی ڈاکٹر کو دیکھے بغیر اپنی تخلیق میں مگن کہہ دیتا ہے۔

آخر میں کروں کیا؟ وہ دو مرتبہ میرے کلینک آچکی ہے۔ دونوں مرتبہ میں نے اُن سے جھوٹ بولا ہے کہ وہ میرے تڑے کا یار ہے۔ میں نے اُس کا گھر نہیں دیکھا۔

بہت اچھے ڈاکٹر بہت اچھے۔ بہانے بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔

کب تک میں جھوٹ بولتا رہونگا۔

بس کچھ دنوں کی بات ہے، پھر میں خود آپ سے کہونگا۔

ٹھیک ہے، صرف تین دن، اُس کے بعد میں اُنہیں اس گھر کا پتہ بتادونگا۔

ٹھیک ہے، لیکن تین دن نہیں بتانا۔

ٹھیک ہے، میں اب کلینک جارہاہوں پھر بعد میں بات کرتے ہیں۔

خدا حافظ ڈاکٹر صاحب۔ ڈاکٹر شیر کے کمرے سے نکلتے ہی روفی نے پیچھے سے مسکرا کر بلند آواز میں کہا۔

روفی کے دل کی دنیا اپنے گھر میں بیٹھی کڑائی کا کام کر رہی تھی کہ گھر کی گھنٹی بجی۔ گھر کے اندر سے لڑکی نے آواز دی۔ کون ہے؟

باہر گلی سے آواز آئی کہ۔ باجی ڈاکیہ ہوں، آپ کا ڈاک ہے۔ اچھا آتی ہوں۔ دروازہ کھولتے ہی۔ ڈاکیہ نے اُسے ایک بہت بڑا فریم تھمایا، وہ اسے کمرے میں لے گئی۔ فریم پر بھیجنے والے کا پتہ نہیں لکھا تھا۔ وہ حیران تھی کہ یہ کس نے بھیجا ہو گا۔ کئی ایسا تو نہیں کہ ڈاکیہ غلط پتے پر دے گیا ہو۔ اس نے خود کلامی کی۔ جب فریم کھولا گیا اسے اپنی آنکھوں پہ یقین ہی نہیں آیا۔ فریم کو ایک کرسی پر رکھا ہے اور خود سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ کر فریم کو بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ جس میں اُس کی تصویر ہاتھ سے بنی ہوئی تھی یہ کس نے بھیجی ہے؟ میری اتنی پیاری تصویر وہ بھی ہاتھ سے بنی ہوئی، اتنی نفاست سے کون بنا سکتا ہے، کون ہو سکتا ہے؟ اس وقت اس کے دماغ میں کئی سوالات گردش کر رہے تھے۔ لیکن جواب کس کے پاس تھا؟ بلا آخر ایک خط جو کہ فریم کے اندر تصویر کے ساتھ چسپاں تھا۔ اسے ملا اور تمام سوالات کے جوابات بھی، وہ بڑے غور سے اس خط کو پڑھنے لگی۔ خط کا متن تھا۔

سلام

امید کرتا ہوں کہ آپ خیریت سے ہو نگی۔ آپ حیران ہو نگی کہ میں کون ہوں اور آپ سے کیا چاہتا ہوں؟ صرف اتنا بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں وہ

ہوں جس نے آپ کی تصویر بنا کر اُس کی ایم فرسٹ کلر کاپی آپ کو بھجوائی ہے۔ میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا اور نہ میں آپ کو اپنا نام بتا سکتا ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے۔ بس آپ سے محبت کر بیٹھا ہوں۔

وسلام

فقط، مصور

لڑکی خط کو دیکھ کر حیران تھی۔ کبھی خط اور کبھی تصویر کو تکنے لگی۔ خدا جانے وہ کون تھا، اور وہ اس خط کو کیوں اتنی توجہ کیوں دے رہی تھی۔ خط کے اظہار محبت نے اسے آہستہ آہستہ اپنے حصار میں لینا شروع کیا۔۔۔

یار! میری بات سنوں، تم ایسا مت کرو، یہ تم اپنے ساتھ اور اپنے چاہنے والوں کے ساتھ بہت بُرا کر رہے ہو۔ میرے ساتھ تو سب سے زیادہ بُرا کر رہے ہو۔ تم ایسا مت کرو، پلیز مت جاؤ، یہاں تمھارے ہنر کی بہت قدر ہے۔ ڈاکٹر شیر روفی کی منت سماجت کر رہا تھا۔

دوسری جانب مئیر کی بہن ماہ جبین اپنے کمرے میں بیٹھی اپنی تصویر کو غور سے دیکھ رہی ہے اور اپنے آپ سے مخاطب ہے۔

کتنی نفاست اور ہنر سے یہ تصویر بنائی ہے۔ کتنا پیار اور اخلاص اس تصویر سے ظاہر ہو رہا ہے۔ کاش میں تمھیں دیکھ سکتی، مصور! تمھیں کیا پتہ کہ میں تمھارے ہنر پر فدا ہو چکی ہوں۔ میں بن دیکھے دل دے بیٹھی ہوں، میں نے کبھی کسی کو نہیں چاہا، مصور! ایک مرتبہ مجھے اپنا دیدار کرا دو، ایک مرتبہ مصور صرف ایک مرتبہ۔ انہی خیالوں کے ساتھ ہی اُس نے اپنے چہرے سے سیاہ و سفید بکھرے ہوئے بالوں کی لٹ بڑے ناز و ادا سے ہٹائی۔

ڈاکٹر صاحب!!!

میں مجبور ہوں، آپ میری مجبور کیوں نہیں سمجھ رہے، آپ کو میری حالت کا اندازہ نہیں، میری رات کی نیند اور دن کا سکون برباد ہو چکا ہے۔ اور ان دو تخلیقات نے تو مجھے کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ ایک وہ جو میری خیالی تخلیق تھی اور ایک یہ جو میری زندگی کا سب سے بڑا سپنا تھا، میرے پاس دوسرا کوئی اور راستہ نہیں۔ روفی نے ڈاکٹر کو جواب میں کہا۔

وہ تمھارے ہاتھوں پر فدا ہو چکی ہے۔ ہر روز میرے کلینک آتی ہے اور مجھ سے تمھارا پتہ پوچھتی ہے۔ میں ہر مرتبہ اُسے کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتا ہوں۔ تم ایک مرتبہ تو اُس سے مل لو۔ یار وہ مئیر کی بہن ہے، ہو سکتا ہے وہ تمھارے تمام مسائل حل کر دے۔ ڈاکٹر نے خوشامدی انداز میں کہا۔

ڈاکٹر صاحب! مانتا ہوں وہ میرے ہاتھوں پر فدا ہو چکی ہے، مانتا ہوں وہ میرے تمام مسائل بھی حل کر دینگی، لیکن بقول آپ کے کہ وہ مجھ سے عمر میں بہت بڑی ہے۔ میں اُس کے اولاد کی عمر کا ہوں۔

اور تم جس پر مرتے ہو، وہ؟

ڈاکٹر نے روفی سے اچانک سوال کیا۔

مانتا ہوں کہ وہ میری اولاد کی عمر کی ہے۔ روفی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ اس لیے تو فرار کا راستہ اپنا رہا ہوں۔ جو مجھ سے محبت کرتی ہے وہ میری ماں کی عمر کی ہے۔ اور جس سے میں محبت کرتا ہوں وہ میری بیٹی کی عمر کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب! آپ جائیں اپنے مریض دیکھیں، آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ مجھے تقدیر کے سہارے چھوڑ دیں۔ میں جہاں بھی گیا میرے پیچھے مت آنا۔ یہ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔ روفی نے مایوس کن انداز میں کہا۔

کچھ دنوں کے بعد میڈم ماہ جبین ڈاکٹر شیر کے کلینک آئی۔ آج اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ڈاکٹر سے مصور کا پتہ ضرور پوچھے گی۔ کلینک میں داخل ہوتے ہی ڈاکٹر شیر سے کہا۔

دیکھیے ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے اُس شخص کا پتہ کیوں نہیں دیتے، کیا بات ہے، اگر کوئی مسئلہ ہے تو میں اُسے حل کرنے کی پوری پوری کوشش کرونگی۔ میں اُس شخص کے ہاتھ چومنا چاہتی ہوں جن ہاتھوں سے اُس نے میری تصویر بنائی۔

جی یہ روفی نے آپ کیلئے خط بھیجا ہے۔ ڈاکٹر شیر نے میڈم ماہ جبین کو خط دیتے ہوئے کہا۔

میڈم ماہ جبین نے جلدی جلدی خط کھولا۔ اس خط کا متن تھا۔

محترمہ سلام!

امید ہے کہ آپ اچھی ہونگی۔ میری ملاقات آپ سے شاید مقدر میں نہ تھی۔ میں مجبور تھا کہ آپ سے ملاقات نہ کر سکا۔ اُس کی وجہ ڈاکٹر صاحب خود بیان کریں گے۔ مجھے اور میرے خیالات کو دل سے نکال دیں۔ اپنی زندگی میری یادوں کی وجہ سے برباد نہ کریں۔

فقط: مصور

اُسی دن اس لڑکی کے ہاتھ میں بھی ایک خط تھا۔ وہ اس خط کو بڑے ارمان و چاہ سے پڑھ رہی تھی۔ خط کا متن تھا۔

سلام

امید کرتا ہوں کہ آپ ٹھیک اور خوش ہونگی۔ یہ میرا آخری خط ہے، اس کے بعد کوئی خط یا کوئی چیز میری جانب سے آپ کو نہیں ملے گی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا، میرا سپنا پورا ہوا، وہ مقصد آپ کا جمال تھا۔ میں اور تخلیقات نہیں بناؤں گا اور یہاں سے دور بہت

دور اس شہر سے دور اتنی دور کہ جہاں انسان کی روح تک کانپتی ہو، جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے دیکھنے اور جاننے کیلئے بے تاب ہیں لیکن مجھے دیکھنا اور جاننا میرے خود کے بس میں بھی نہیں۔

آپ کی دعاؤں کا محتاج۔۔۔

فقط: مصور

☆☆☆☆☆☆☆

گمان

اُس کے آنکھوں کے سامنے آہستہ آہستہ اندھیرا چھا رہا تھا۔ پیروں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ چھوٹی آنکھیں، گول گندمی چہرہ مرجھا رہا تھا۔ حسینہ کا حسن ماند پڑتا جا رہا تھا۔

خون، سُرخ خون، گاڑھا خون، جو اس کی کلائی سے بتدریج بہہ رہا تھا، کی وجہ سے اس پر ضعف آنا شروع ہو گیا۔ دل ڈوبا جا رہا تھا۔ نبض کی رفتار کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھی۔ کمرے کے دروازے کی کنڈی جو کہ اندر سے بند تھی کو وہ مایوس کن انداز میں دیکھ رہی تھی۔ گھر کے تمام افراد اپنے اپنے کمروں میں ایسے گھسے تھے جیسے چوہے بلی کے خوف سے اپنے بل میں چپ جاتے ہوں۔

حسینہ کے ہاتھ کی نبض کٹی ہوئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔

رات کے گیارہ بجے تھے۔ حسینہ اپنے کمرے میں آئی، تمام گھر والے اپنے کمروں میں سونے کیلیئے جا چکے تھے۔ حسینہ جو کہ پچیس سالہ گندمی رنگ کی ایک ہونہار اور نیک لڑکی تھی نے اپنی دادی کو دوا پلائی اور آکر اپنے کمرے میں دروازہ اندر سے کنڈی کر کے پلنگ کی جانب بڑھی۔ اچانک اُس کا پیر کسی بڑی چیز سے ٹکرایا اور وہ سامنے رکھے شیشے کی گلدان پر جا گری۔ جس سے اُس کے ہاتھ کی نبض کٹ گئی۔ پہلے تو اُس نے سوچا کہ اتنی زیادہ چوٹ نہیں، ہلکا سا تو کٹ ہے۔ پر آہستہ آہستہ خون کے زیادہ بہہ جانے سے اُس کی آنکھوں کے

سامنے تاریکی پھیلتی گئی۔ زبان گونگ ہو گئی۔ پیروں نے حرکت کرنا چھوڑ دیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اُس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا کہ

لوگ کہیں گے کہ حسینہ نے خود کشی کی ہے، میری نماز جنازہ بھی وقت حاضر کے مولوی نہیں پڑھائینگے۔ مجھ پر طرح طرح کے فتوے لگیں گے۔ میرے والدین شرم سے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہینگے۔ میرے بھائیوں کو لوگوں کے طعنے سننا پڑیں گے۔ میری بھابھیاں اپنے میکے جا کر مجھ پر طرح طرح کی باتیں بنائیں گی۔

لیکن میرے اللہ! تو بہتر جانتا ہے کہ میں نے خود کشی نہیں کی۔

یہ سب دل میں کہتے ہوئے کلمہ پڑھ کر ابدی نیند سو گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆

وسواس

گل خان بوڑھی بیوہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ ایک این.جی او میں اچھی پوسٹ پر تھا۔ غیر شادی شدہ تھا، ماں بیٹا خوشی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن بوڑھی ماں کا ایک ہی سپنا تھا کہ بیٹے کے سر پر سہرا دیکھے۔ خیر دن گزر گئے، گل خان کی شادی بھی ہو گئی۔ گل خان کی بیوی شادی کے شروع کے دنوں میں گل خان کے ساتھ کلوز نہیں تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی زبان چلنے لگی۔ ایسی بات نہیں کہ وہ ساس کے ساتھ سارا دن جھگڑا کرتی، نہیں بالکل بھی نہیں، وہ تو ساس کے معاملے میں ایک اچھی بہو ثابت ہوئی تھی۔ لیکن اُس کے زیادہ بولنے کی وجہ اُس کی زبان نہیں بلکہ مجھے تو دماغی مسئلہ لگ رہا تھا۔

ایک دن گل خان دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ رات اُس نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے کہ میرا فلاں دوست زیادہ خوش ہے اور ناچ رہا ہے۔ بیوی نے جھٹ سے کہا کہ آپ کے اس فلاں دوست کو غم کی خبر ملے گی۔ کیونکہ خواب کے معنی اُلٹ ہوتے ہیں۔ گل خان نے بیوی کی بات کو خاص توجہ نہ دی اور دفتر کیلئے روانہ ہو گیا۔ جیسے دفتر پہنچا تو پہلے سے اس کا وہ دوست جسے وہ رات کو خواب میں دیکھ چکا تھا بیٹھا تھا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد گل خان نے اپنے دوست سے کہا کہ، بتاؤ کیسے آنا ہوا؟ ہم جیسے لوگوں پر نظر کرم کیسا، ہاں بھئی؟

وہ بڑے غمزدہ لہجے میں کہنے لگا کہ، یار میری منگنی ٹوٹ گئی ہے، جس لڑکی کے ساتھ میرا رشتہ طے ہوا تھا اس نے رشتے سے انکار کر دیا اور اپنے ماموں زاد کے ساتھ کراچی بھاگ گئی۔ میں بہت پریشان ہوں کیا کروں؟

گل خان حیران ہوا کہ میری بیوی کی بات سولہ آنے سچ ثابت ہوئی۔ خیر اس نے اپنے دوست کو تسلی دی، شربت پلایا اور کچھ دیر بعد رخصت کیا۔

دن گزرا، رات کھانے پر گل خان نے اپنی بیوی کو دوست کے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی کہ دیکھا میں نے نہیں کہا تھا۔

گل خان نے بھی ہاں کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔

صبح گل خان دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ بیوی نے کہا

گل خان! آج کے دن آپ نے جو بھی گھر سے باہر پہلے دیکھا تو وہ آپ کے ساتھ ہوگا۔

گل خان حیران ہوا کہ یہ عورت کیا کہہ رہی ہے۔

کیا، کیا مطلب؟

میرا مطلب ہے کوئی تحریر، پیسے وغیرہ

گل خان نے مسکرا کر کہا کہ دعا کرو کہ روپوں سے بھرا سوٹ کیس دیکھ لوں۔

خیر وہ گھر سے نکلا، رکشے میں بیٹھا، رکشہ شہر کے مختلف راستوں سے ہو کر اُس کے دفتر کے سامنے رُکا۔ گل خان نے رکشے والے کو کرایہ دیا، رکشہ روانہ ہوا تو رکشے کے پیچھے کے ٹاٹ پر کچھ اس طرح کی تحریر لکھی گئی تھی (نصیب اپنا اپنا، قسمت اپنی اپنی) گل خان نے اس تحریر پر توجہ نہ دی۔ لیکن جب دفتری کی سیڑھیوں پر چڑنے لگا تھا تو پہلی سیڑھی پر نظر پڑی جس پر ہزار روپے کا نوٹ پڑا تھا۔ اُس نے جلدی جھک کر نوٹ اٹھانا چاہا

تو ہوا کا ایک جھونکا آیا اور نوٹ کو ساتھ لے گیا۔ نوٹ جا کر ایک افیمی کے پاؤں کے ساتھ رُکا۔ افیمی نے جلدی سے نوٹ اٹھایا اور بھاگا۔ گل خان نے پیچھے سے بہت آوازیں دیں۔ رُک جاؤ، یہ میرا نوٹ ہے، رُک جاؤ، ورنہ پیٹھونگا۔ رُک جاؤ۔ افیمی کہاں رکنے والا تھا۔ اُس کی تو لاٹری لگ گئی تھی۔ وہ نعرے لگاتا ہوا جا رہا تھا کہ نصیب اپنا اپنا، نصیب اپنا اپنا۔

گل خان واپس اپنے دفتر مڑا۔ سارا دن اسی سوچ میں تھا کہ یہ کیا ماجرہ ہے۔ بیوی کی بات بھی سچ ثابت ہوگئی تھی۔ خیر شام ہوگئی، گل خان چھٹی کر کے گھر آگیا۔ رات کھانا کھانے کے بعد بیوی کو سارا ماجرہ سنایا۔ بیوی کو بجائے افسردہ ہونے کے خوش ہوگئی۔ بولی کہ میں نے نہیں کہا تھا، کیسی میری بات سچ ثابت ہوئی۔ خیر پھر رات گزری، صبح ہوگئی، گل خان آج بھی پچھلے دنوں کی طرح دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ بیوی نے وہی کل والی بات دہرائی۔ گل خان گھر سے نکلا، رکشہ میں بیٹھا اور دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک جگہ بہت زیادہ رش تھا۔ رکشہ والا بھی پریشان کھڑا تھا۔ راستہ بند تھا۔ گل خان کی نظر آگے والے رکشے کے پچھلے ٹاٹ پر پڑی۔ اس پر ایک عجیب و غریب تحریر لکھی گئی تھی کہ (شہر کا جہاز)۔ گل خان کو اس تحریر پر ہنسی آئی کہ صحرا کے جہاز یعنی اونٹ کا تو سنا تھا لیکن آج شہر کا جہاز پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ خیر رش بھی ختم ہونے لگا۔ رکشہ والا روانہ ہوا، تھوڑی دور آگے جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک اونٹ روڈ کے کنارے مرا پڑا ہے۔ روڈ بھی اسی کی وجہ سے بند تھا۔ گل خان حیران ہوا کہ رکشے کے ٹاٹ پر شہر کا جہاز اور یہاں صحرا کا جہاز مرا پڑا ہے۔ اسے معلوم کرنا کہ اونٹ کیسے مرا بڑا مشکل لگ رہا تھا۔ کیونکہ دفتر کیلئے وہ لیٹ ہو رہا تھا۔ دن گزرا، رات ہوئی، گل خان گھر آیا، وہ اپنی بیوی کو آج کے واقعے کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ کھانا کھایا، لیکن بات پیٹ میں رہ نہیں پا رہی تھی۔ بیوی بھی تجسس میں تھی کہ آج شوہر نے کیا دیکھا ہوگا۔ خیر وہ وقت بھی آگیا جب گل خان نے اپنی بیوی کو سارا واقعہ سنا

دیا۔ بیوی خوشی کے مارے یہ بھی بھول گئی تھی کہ ساس کو دوا پلانی ہے۔ ساس اس انتظار میں تھی کہ بہو آئے گی اور مجھے دوا پلائے گی۔ لیکن بہو نہیں آئی۔

رات گزری، صبح ہوئی۔ آج گل خان خود اس فکر میں تھا کہ کیا دیکھنے کو ملے گا۔ بیوی نے پھر وہی بات دہرائی لیکن گل خان کے منہ سے نکلا کہ، ارے ایسا نہ ہو کہ موت کی تحریر دیکھنے کو ملے تو پھر تم کیا کرو گی۔

بیوی نے جواب میں کہا کہ اُسے اُلٹ دو، موت کو زندگی میں بدل دو۔ گل خان یہ سن کر مسکراتا ہوا گھر سے نکلا۔ رکشہ میں بیٹھا اور دفتر کی جانب روانہ ہوا۔ پھر وہی بڑا روڈ بند تھا۔ گاڑیوں سے زیادہ رکشوں نے روڈ بلاک کیا تھا۔ سرخ، سبز، پیلے رنگا رنگ قطار در قطار کھڑے تھے۔ یہ رکشہ ڈرائیور بھی عجیب ہوتے ہیں۔ جو جی میں آیا رکشے کی پچھلی ٹاٹ پر لکھا، یا بنایا۔

مثلاً ارمانی دنیا، میں چلا تم دعا کرنا، پیار قربانی مانگتی ہے، زخمی دل، دیکھ مگر پیار سے، بے وفا صنم، گل نرگس، گورنر راج، گل میر وائس، دل جلے، وغیرہ۔ ہر کسی نے اپنے دل کی بات رکشے کے پچھلی ٹاٹ پر لکھی تھی۔ لیکن گل خان کی نظر جس تحریر پر پڑی اس سے دل بیٹھ گیا۔ رکشے کے پچھلے ٹاٹ پر لکھا تھا (موت بر حق ہے، کفن میں شک ہے) گل خان یہ تحریر دیکھتے ہی بیوی کی بات بھول گیا کہ موت کو زندگی میں بدل ڈالو۔ رکشہ چل پڑا، سیدھا دفتر کے سامنے روڈ کے دوسرے کنارے کھڑا ہوا۔ گل خان رکشے سے اُترا، کرایہ دیا، لیکن روڈ کراس نہ کر سکا۔ کیونکہ اس وقت ایک فوجی قافلہ یہاں سے گزرنے والا تھا، جس کی وجہ سے روڈ کراس کرنا منع کیا گیا تھا۔ قدم قدم پر سیکورٹی فورسز کھڑے تھے۔ گل خان وہی کھڑا قافلہ کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ گل خان سے چند قدم ساتھ ہی ایک نوجوان سردی سے بچنے کیلئے چادر میں لپٹا کھڑا تھا۔ جوان کی نظر جب گل خان پر پڑی تو وہ

مسکرایا۔ فوجی قافلہ آیا، جونہی درمیان کی گاڑیاں آئی تو ساتھ کھڑا نوجوان گاڑیوں کی طرف اچانک بھاگا اور ساتھ ہی ایک بڑے دل کو ہلانے والے دھماکے کی آواز آئی۔ ارد گرد سیاہ گرد پھیل گیا۔ آدھا فوجی قافلہ اس دھماکے کے زد میں آیا تھا۔ بے شمار فوجی شہید اور زخمی ہوگئے تھے۔ عام عوام میں بھی بہت سے لوگ شہید یا زخمی ہوگئے تھے۔ ہر طرف بارود کی بدبُو پھیلی تھی۔ لوگوں کی چیخ وپکار نے قیامت کا ساسا برپا کر دیا تھا۔ کسی کی ٹانگیں، کسی کے ہاتھ تو کسی کے سر نہ تھے۔ کسی کے تو آدھے جسم تک غائب تھے۔ خون، بدبُو اور سیاہ گرد نے شہر کی رونق ختم کر دی تھی۔ گل خان کے وجود کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ وہ زندہ تھا کہ مر چکا تھا بہت عرصے تک یہ معلوم نہ ہو سکا۔ گل خان کی ماں نے جب سنا تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی تو وفات پا گئی۔ گل خان کی بیوی کا دماغی توازن خراب ہو چکا تھا۔ وہ ہنستی، اس کا رونا اور عام زندگی ختم ہو گئی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر خود سے کہتی کہ

اب گل خان کے آنے کا وقت ہے، خدا جانے آج اُس نے کیا دیکھا ہو گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

مبارز

ہر وہ اچھی صفت اُس میں تھی جس کی ایک انسان طلب کرتا ہے۔ سمجھ دار، بااخلاق، علم و ادب، دین کے بارے میں بڑی حد تک معلومات اور علم با عمل، پانچ وقت نمازی، کلام اللہ کی ہر روز تلاوت۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ اُس کے ساتھ دوستی کرے۔ گاؤں کی ہر شادی اور فوتگی میں شرکت اُس کے اوصاف کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ خانزادہ جو ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا والد سر فرزاخان محنت مزدوری کرکے خانزادہ کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھتا۔

خانزادہ بچپن سے ہی بہت ذہین اور اعلیٰ اخلاق کا مالک تھا۔ جب وہ دس سال کی عمر کو پہنچا تو مادری زبان سے دلی محبت پیدا ہو گئی۔ آہستہ آہستہ خانزادہ کو کچھ ایسے دوست ملے جو ایک قوم پرست سیاسی پارٹی میں متحرک تھے۔ خانزادہ نے بھی وہی پارٹی جوائن کی اور مادری زبان کے ساتھ ساتھ اپنے قوم کی خدمت بھی شروع کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ پارٹی میں فعالیت کی بنا پر ترقی کرتا گیا اور پندرہ سال اپنے گاؤں، محلے کی خدمت کرتا رہا۔ ملک میں خانہ جنگی کی وجہ سے پارٹی کے سربراہان اپنے گھروں میں نظر بند یا پھر ملک بدر کیے گئے۔ جس کی وجہ سے سیاسی و قومی سرگرمیاں کافی حد تک بند ہو گئی۔ لیکن ایسے حالات میں بھی خانزادہ نے اپنے ساتھیوں کو متحرک رکھا۔ ملک و قوم کی دفاع کی خاطر نام نہاد مذہبی پارٹیوں کے علاقائی رہنماؤں کے ساتھ ہر وقت بحث و مباحثہ کرتا۔ یہاں تک کہ خانزادہ کے گاؤں میں دوست کم اور دشمن زیادہ ہو گئے۔ خانزادہ کا مبارزہ قوم اور ملک کیلئے تھا۔ پارٹی بھی روز بروز ترقی کرتی جا رہی تھی۔ ہر روز کسی نا کسی گاؤں میں جلسے جلوس

کرتا، اپنے جذباتی تقاریر میں کہتا کہ: میرے عزیزوں، ہمارے قوم کے ساتھ عرصہ دراز سے بُرا ہوتا آرہا ہے۔ ہماری مازدری زبان جو گھروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے حکومت وقت کو چاہیئے کہ تمام چھوٹی زبانوں کو تعلیم، سرکار، دربار اور عدالت کی زبانیں قرار دیں۔ خانزادہ سیاست کے ساتھ ساتھ ادب کے ذریعے بھی اپنے قوم کو بیدار کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

خانہ جنگی کے ختم ہوتے ہی خانزادہ کی سیاسی زندگی تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ نہ دن کا پتہ نہ رات کا۔ پارٹی کے ساتھیوں کے ساتھ تو بھائی سے بڑھ کر کام آتا۔ یعنی پارٹی کارکن اسے بھائی اور والد سے بھی قریب تھے۔ جب خانزادہ کی فعالیت کو دوسری پارٹیوں کے علاقائی رہنماؤں نے دیکھا تو خانزادہ کو اپنی پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مراعات کی بھی پیشکش کی گئی۔ مجھے یاد ہے خانزادہ انہیں بڑے پیار سے جواب دیتا کہ

خدا نے مجھے اس مٹی، زبان اور قوم کی خدمت کیلئے پیدا کیا ہے۔ کتنا اخلاص تھا اس کی باتوں میں۔ واقعی خانزادہ اپنے ملک اور قوم پر عاشق تھا۔ اس نے کبھی اپنا نظریہ نہیں بدلہ۔ وہ اپنے نظریے پر مستحکم کھڑا تھا۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ خانزادہ اپنی سیاسی زندگی میں دن رات مصروف تھا۔ وہ پارٹی کے نعرے وغیرہ دیواروں پر لکھتا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ پولیس آتی، خانزادہ کو تھانے لے جاتی۔ اور پھر جب اس کے ساتھیوں کو پتہ چلتا تو وہ اسے چھڑانے آتے۔

ملک میں الیکشن کے دن آئے۔ خانزادہ بھی اپنی پارٹی کی کامیابی کیلئے دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ خانزادہ کی پارٹی پورے ملک میں بڑی اکثریت سے کامیاب ہوگئی۔ اب خانزادہ

کے ارمان پورے ہونے کو تھے۔ مجھے یاد ہے جب وہ اپنے پارٹی ساتھیوں سے کہتا کہ اب ہم اپنے قومی اہداف کے نزدیک ہیں۔ اب ہماری مادری زبان سرکار اور دربار کی ہو جائے گی۔ اب ہمارے پہاڑوں، جنگلات پر ہمارا اپنا اختیار ہو گا۔ اب ہم اس ملک میں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے رہیں گے۔ ہم ہر وقت آزادی کا جشن منائیں گے۔

وقت گزرتا رہا، خانزادہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ملک اور قوم کی خدمت میں لگا ہوا تھا کہ اچانک پارٹی میں ایک ایسی تبدیلی رونما ہو گئی جسے دیکھ کر خانزادہ حیران و پریشان رہ گیا۔ پارٹی کے اندر ممبران کے درمیان مفادات کی جنگ چھڑ گئی۔ مفاد پرست ٹولہ ایک طرف اور پارٹی کا سربراہ، نظریاتی کارکن جن میں خانزادہ بھی شامل تھا دوسری طرف ہو گئے۔ ایک دوسرے پر لعن طعن بھیجتے۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے کے گریبان تک پہنچ گئے۔ سفارش اور رشوت عام ہو گئی۔ نظریاتی کارکن تمام کے تمام نظر انداز ہو گئے۔ وہ کارکن آگے اور ترقی کر گئے جنہیں قومی تحریک کی الف ب تک معلوم نہ تھا۔ تحریک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ان حالات میں خانزادہ تنہا رہ گیا۔ والدین کی وفات کے بعد چھوٹے چھوٹے بچے خانزادہ کے سہارے رہ گئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ بے روزگاری بھی اُسے ان یتیم بچوں کے ساتھ میراث میں ملی۔

مجھے یاد ہے وہ خانزادہ جو کہ بہت ہی قابل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا کبھی بیلچہ ہاتھ میں لیے دیہاڑی کرتا تو کبھی لوگوں کے گھروں میں کام کرتا۔ ایسا وقت بھی آیا کہ وہ کوڑہ کرکٹ جمع کر کے ان یتیم بچوں کا پیٹ پال لیتا۔ خانزادہ جیسا مخلص باہمت اور تعلیم یافتہ سیاسی کارکن لوگوں کے مذاق کا موضوع بن گیا۔ جب کبھی خانزادہ گاؤں میں جا رہا ہوتا تو لوگ پیچھے سے طنزیہ آواز کستے کہ، وہ دیکھو قوم کا مبارز جا رہا ہے۔ قوم اور ملک آزاد کر کے آ رہا ہے۔ خانزادہ یہاں تک ڈپریشن کا شکار ہوا کہ اس نے نشہ کرنا شروع کیا۔ پارٹی سربراہ

اپنے گھر تک محدود رہے۔ کبھی بھی کسی سے نا پوچھا کہ میرے کارکن کس حالت میں ہیں۔ وہ کارکن جو مفادات کی خاطر اس پارٹی میں شریک ہوئے تھے روز بروز اقتصادی ترقی کر رہے تھے۔ جب کبھی خانزادہ سے ملاقات ہوتی تو کہتے چلو ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ تم بھی ترقی کر لوگے۔ مجھے یاد ہے کہ خانزادہ کا اُن کو بہت ہی خوبصورت جواب ہوتا۔ میں قوم دوست ہوں، قوم دشمن نہیں۔ میں نے اس پارٹی میں اپنا خون پسینہ شامل کیا ہے۔ میں کبھی بھی نہیں بکوں گا۔ ماضی میں بعض پارٹی سربراہان کی غلط باتوں کی وجہ سے خانزادہ کو مذہبی علما سے نفرت ہو گئی تھی۔ اب سوچ رہا تھا کہ میں تو نا قوم کا ہوا نہ امام کا۔

والد بیچارہ اسے ہر وقت کہتا کہ بیٹا! یہ سیاست وغیرہ چھوڑ دو، کوئی کام دھندہ اپنے لیے ڈھونڈو۔ کل کو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ مجھے یاد ہے کہ خانزادہ اپنے والد کو اس انداز میں جواب دیتا کہ بابا! جب تک میں اپنے اس ظلم اور جبر کی چکی میں پسے ہوئے قوم کو آزادی نہ دلاؤں کام نہیں کر سکتا۔ ہاں جب یہ قوم آزادی حاصل کرے گی تب آپ دیکھنا کہ میری پارٹی پھر کیا کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پارٹی مجھے نہیں بھولے گی۔

والد بیچارہ اس آسرے پر کہ میرے بیٹے کی پارٹی میرے بیٹے کو افسر بنادے گی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

خانزادہ کا قصور نہیں تھا۔ پارٹی کے کچھ سربراہان نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے پارٹی اقتدار میں آئے گی پہلی فرصت میں تمھارے روزگار کا بندوبست کرے گی۔ لیکن افسوس جیسے ہی پارٹی اقتدار کی کرسی پر بیٹھی اپنے نظریاتی کارکن کو بھول گئی۔

آج خانزادہ کو اپنے والد کی باتیں یاد آگئی، وہ گاؤں کے ایک بڑے کوڑہ کرکٹ پر بیٹھا مجھے یہ باتیں کہہ رہا تھا۔ خانزادہ کہہ رہا تھا، کہ کاش میں نے اپنے والد کی بات مانی ہوتی تو آج یہ دن نہیں دیکھنے پڑتے۔

خانزادہ کے کپڑے پھٹے، ننگے پاؤں اور گرد سے بھرے بال میرے سامنے بیٹھا ہے۔ میں اس کیلئے کھانے کی چیزیں لایا تھا، مگر خانزادہ بضد تھا کہ مجھے کچھ روپے دو تاکہ میں اپنے لیے ہیروئن خرید لوں۔ سارا جسم درد کر رہا ہے۔

وہ پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا کہ، آج میں اپنے ساتھیوں کیلئے بیگانہ ہوں، یہ میری سزا ہے جو میں نے اپنے والد کی بات نہیں مانی۔ اسی بات کے ساتھ خانزادہ کے آنکھوں سے آنسو کے بڑے بڑے قطرے اُبل پڑے اور نیچے زمین پر پڑے گند میں غائب ہو گئے۔ کھانے کی چیزیں ایک کر کے وہاں سے اُٹھا اور چل پڑا۔ میں نے پوچھا کہ خانزادہ کہاں؟ یہ تو کھالو، یہ میں تمھارے لیے لایا ہوں۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک طرف کو چلتا رہا۔ گاؤں کے ایک بڑے گندھے نالے میں اُتر گیا۔

وہ تعلیم یافتہ خوبصورت جوان جس نے بیس سال قوم اور ملک کی خدمت میں گزارے آج کتنا بے بس اور بے یارو مدد گار تھا۔ سارا علم و ادب اس نے نشے کے دھویں میں اُڑا چکا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ پارٹی یا پھر اس کی راست بازی؟ اور میں نہیں جانتا کہ خانزادہ کا انجام کیا ہو گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

چمچہ

وہ صبح سے بھوکا پیاسا کوئٹہ شہر کے سڑکوں پر پھر رہا تھا۔ ایک پیسہ تک اس کے پھٹے پرانے کپڑوں کے جیب میں نہ تھا۔ غیرت اسے یہاں تک لائی تھی کہ کسی کے سامنے ہاتھ بھی نہیں پھیلا رہا تھا۔ اب بھوک نے بُرا حال کر دیا، سوچ میں پڑا کہ اس نامراد پیٹ کے بھوک کا کیا کیا جائے۔ گنجا سر، لمبی مونچھیں، بڑی داڑھی، چھوٹا قد، لمبا میلا واسکٹ پہنے ہوئے، قمیض کے بٹن کھلے ہوئے، تیز نیلے کپڑے پہنے، پسینے سے شرابور تھا، چپل جو ایک ٹوٹی تھی پاؤں میں سیٹھ موتی رام کے آٹے کے گودام کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوا شخص اسد تھا۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ سیٹھ موتی رام دروازے کے سامنے گودام میں بیٹھا حساب کتاب میں مصروف تھا۔ اسد بھی دروازے کے سامنے کھڑا سیٹھ موتی رام کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ سیٹھ موتی رام کا منشی جو کہ ایک مسلمان تھا، سیٹھ موتی رام کے سامنے مودبانہ کھڑا تھا، کی نظر اچانک اسد پر پڑی۔ ایک دم چلایا۔

کیوں یہاں کھڑے ہو؟ بھاگ جاؤ یہاں سے۔

سیٹھ نے بھی نظر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔

اسد بھی ڈر گیا اور خود کو ایک افیمی کی طرح اپنے ننگے سینے کو کریدنے لگا۔ مُڑا، جانے ہی لگا تھا کہ سیٹھ نے پیچھے سے آواز دی۔

رُک جاؤ، یہ لو۔

سیٹھ نے دس روپے کا ایک پُرانا نوٹ منشی کو تھماتے ہوئے کہا کہ، یہ دے دو اُس شخص کو۔

منشی آیا اور قہر زدہ لہجے میں اسد کو دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

یہ لو، ایک تو تم لوگوں سے تنگ آ گئے ہیں ہم، سارا دن تم لوگ ہو اور بھیک ہے۔ یہ کہتے ہی منشی واپس گودام کے اندر چلا گیا اور اسد دس روپے کا نوٹ اپنی مُٹھی میں دبا کر ایک طرف کو چل دیا۔ دس کا نوٹ ملتے ہی اسد کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اب اس دس روپے میں کھا لیا جائے۔ اُس نے سوچا۔ جاتے جاتے ایک دکان کے سائن بورڈ پر نظر پڑی جس پر لکھا تھا۔

بمبئی بریانی۔ فی پلیٹ دس روپے۔

دل خوش ہوا اور دکان کی طرف بڑھا۔ جب دکان کے قریب پہنچا تو بریانی کی خوشبو اُس کی ناک سے ہوتی ہوئی دماغ تک پہنچ گئی۔ جلدی جا کر دکان میں ایک ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک دس سالہ بچہ آیا اور اُس سے مخاطب ہوا،

سنگل یا ڈبل؟

اسد نے جلدی سے دس روپے کا نوٹ آگے کیا۔ جب بچے نے اُس کے ہاتھ سے دس روپے کا نوٹ لیا تو نوٹ اُس کے ہاتھ کے پسینے سے نم زدہ اور خستہ ہو چکا تھا۔ بچے نے اسد کو نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا۔

یہ نہیں چلتا۔

بہت بھوکا ہوں، بس یہی ہے۔

بچہ نوٹ لیے واپس مُڑا اور ایک زوردار نعرہ لگایا۔

ایک سنگل۔

تھوڑی دیر بعد بچہ ایک جگ پانی اور ساتھ ایک خالی گلاس لے آیا اور اسد کے سامنے ٹیبل پر رکھ کر واپس چلا گیا۔ اسد نے جلدی جلدی جگ سے پانی کا گلاس بھرا اور ایک ہی سانس میں پی لیا۔ پھر دوسرا گلاس بھرا اور وہ بھی ایک ہی سانس میں حلق سے اُتارا۔

دس سالہ بچہ آیا، اسد کے سامنے بریانی کی پلیٹ رکھی، جس کے ساتھ دو چمچ بھی تھے۔ اسد نے سوچا کہ ایک چمچ تو خوراک کیلئے ہے پر یہ دوسرا چمچ جو نوکیلا ہے، کس لیے ہے؟

غربت اور فاقوں کی وجہ سے یہاں تک پہنچا تھا کہ اپنے آپ سے باتیں کیا کرتا تھا۔ تھوڑا سوچنے کے بعد بچے کو آواز دی، وہ آیا۔

جی اور کیا چاہیئے؟

ایک بات پوچھنی تھی۔ یہ ایک چمچ تو خوراک کیلئے ہے، یہ دوسرا نوکیلا چمچ کس لیے ہے؟

یہ گوشت کیلئے ہے۔

گوشت کیلئے؟

ہاں جی۔

کہاں ہے گوشت؟

بریانی میں۔

اُس نے جلدی سے خوراک کا چمچہ اٹھایا اور بریانی میں گوشت ڈھونڈنے لگا۔ بریانی کی آخر میں بالکل نیچے چکن کی ایک بہت ہی چھوٹی بوٹی نظر آگئی۔ جب اُس نے بوٹی کو دیکھا تو مسکرا کر نوکیلا چمچ اُٹھایا اور اپنے آپ سے کہا۔ چل نوکیلے چمچے آج دیکھتا ہوں تُو اس بوٹی کے کتنے حصے کرتا ہے۔ چکن بوٹی کو نوکیلے چمچ سے کریدنے لگا پر بوٹی کا کچھ نہیں ہوا۔ بچہ نزدیک کھڑا اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سمجھ گیا کہ جاہل ہے، یہ چیزیں نہیں دیکھی ہو گی۔ قریب آیا، اسد سے نوکیلا چمچ لیا، دوسرا کھانے کا چمچ بھی اُٹھایا۔ کھانے کا چمچ بوٹی کو دبایا اور نوکیلے

چمچ سے بوٹی کے دو ٹکڑے کیے۔ اسد یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ تو اس کی چمچہ چمچ ہے۔ اُس نے بچے سے چمچ لیا، بچہ وہاں سے مسکرا کر چلا گیا۔ اب اسد چمچ کو غور سے دیکھ کر اپنے آپ سے مسکراتے ہوئے باتیں کرنے لگا۔

ہائے چمچو، تم بھی کتنے کام کی ہو۔ جو قد آور ہو گا، بڑی دیگ میں کام آؤ گے۔ درمیانے قد کا ہو گا تو چھوٹے دیگ میں کام آؤ گے۔ اور اگر بہت ہی، بہت ہی چھوٹا قد ہو گا میری طرح تو چائے میں چینی ملانے کے کام آؤ گے۔ تم بھی عجیب ہو، کھانے والے چمچ، نوکیلے چمچ، پلین چمچ، جالی دار چمچ، واہ کیا عجیب و غریب نام اور اقسام ہیں تمھارے۔ گھر میں بیویوں کے ہاتھوں میں اور شوہروں کے سروں پر ایک ہتھیار کی طرح استعمال ہوتے ہو۔

ارے میں تو بھول ہی گیا۔ تم تو انسانی خصلت کے مالک بھی ہو۔ ہر امیر کے بغل میں، افسروں کے ساتھ، مولویوں کے ساتھ، سیاسی لیڈروں کے ہمراہ، واہ چمچو واہ۔

جیسے وہ منشی سیٹھ منشی رام کا چمچہ تھا۔ اسد چمچو کے ساتھ مخاطب تھا۔ چمچہ اٹھایا اور بریانی سے اپنے پیٹ کا دوزخ بھرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ختم شد

Get more e-books from www.ketabton.com